ہفت روزہ

ندائے خلافت

۱۳ / جون ۱۹۹۴ء

☆ داعیٔ تحریک کے دوسرے خطبے کی تیسری اور آخری قسط

☆ ڈاکٹر اسرار احمد پر اخباری دانشوروں کی غیر دانش مندانہ یلغار

☆ امریکہ نے اپنی اسرائیل پروری پر کبھی پردہ نہیں ڈالا

حدیثِ امروز

بات چل نکلی ہے' اب دیکھیں کہاں تک پہنچے!

پاکستان میں ملکی سیاست کھیل کے اصولوں کی پابند تو کبھی نہیں رہی تاہم اگلے وقتوں میں کچھ تھوڑا سا رکھ رکھاؤ پایا جاتا تھا جو رفتہ رفتہ ختم ہوتے ہوتے آخر کار گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ بالخصوص پچھلے سال سوا سال میں سیاست کے معاملات جس نہج پر چلے ہیں وہ اب اپنی منطقی انتہا کو پہنچتا نظر آ رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آگے کنواں ہے یا کوئی کھائی' انتظار ایک نئے مارشل لاء کا کیا جائے یا کسی نگران وزیر اعظم کا جو امریکہ بہادر سے پروانہ تقرری لے کر آیا ہوا۔

یہ خیال بڑا خوش آئند تھا کہ گزشتہ دو عام انتخابات نے ہماری جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی پر ڈال دیا ہے یعنی ریل کی دو لائنوں کی طرح اب یہاں بھی دو بڑی سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئی ہیں جن میں سے ایک مسلم لیگ ہے اور دوسری پیپلز پارٹی لیکن افسوس کہ یہ مفروضہ بھی خیال خام نکلا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں سیاسی جماعت کہلائے جانے کی مستحق کوئی تنظیم موجود ہی نہیں' محض دو دھڑے ہیں' ایک "پرو پی پی پی" اور دوسرا "اینٹی پی پی پی" اور ان میں تعلقات کار پیدا کرنے کی کوشش بلکہ اس کی خواہش بھی کار عبث ہے۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں اصولی و فروعی اور ذاتی و گروہی اختلافات کے باوجود حکومت چلانے کے لئے کسی نہ کسی مفاہمت کی ضرورت ایک مسلمہ امر ہے کیونکہ اس نوع کے تعلقات کار کے بغیر پارلیمانی نظام حکومت بے سروپا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اکتوبر ۹۳ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی حکومت اور اپوزیشن کے مابین وفاقی سطح پر سب سے زیادہ اور صوبوں کی سطح پر درجہ بدرجہ محاذ آرائی کی روز افزوں شدت نے کسی بھی بامقصد و بامعنی مفاہمت کو جڑ پکڑنے کا موقع ہی نہیں دیا اور تازہ واقعات نے تو اس کی امید پر بالکل ہی پانی پھیر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال زیادہ دیر جوں کی توں رکھی نہیں جا سکے گی اور ہماری بگڑی بنانے کو "مردے از غیب" جلد ہی نمودار ہو کر رہے گا۔

قائد حزب اختلاف' محمد نواز شریف صاحب کی طرف سے اب براہ راست صدر مملکت جناب فاروق احمد خاں لغاری کو نشانے پر رکھنے کی حکمت سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ موجودہ صدر ہماری وزیر اعظم کی قوت کا سرچشمہ کہے جا سکتے ہیں۔ عوام جنہیں محض بنانے کو قوت کا سرچشمہ کہا جاتا ہے' ۱۹۸۸ء میں بھی زیر دام آ گئے تھے اور ۱۹۹۳ء میں بھی شیشے میں اتار لئے گئے لیکن یہ سابق صدر ہی تو تھے جنہوں نے بے نظیر بھٹو صاحبہ کو اگست ۱۹۹۰ء میں وزارت عظمیٰ کے منصب کو بہ حسرت و یاس خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ نئے صدر کی طرف سے وزیر اعظم کو ہر طرح اطمینان ہے اور قائد حزب اختلاف اسی اطمینان سے انہیں محروم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے صدر لغاری پر بدعنوانی کے سنگین الزامات عائد کئے ہیں اور یوں وہ دیپک راگ چھیڑ دیا ہے جس سے ہماری پارلیمانی جمہوریت کے جسد ناتواں میں شعلے بھڑکنے کے امکانات نظر آتے ہیں ---- بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے ---- ہونی ہو کر رہے گی لیکن احتساب کا عمل اسی بہانے اگر واقعی شروع ہو گیا تو شاید کبھی آگے چل کر ہی ملک و قوم کے حق میں مفید ثابت ہو۔ صدر فاروق لغاری نے اپنے خلاف الزامات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا اور بجا طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کا ایک فی صد بھی درست ہو تو مجھے اس جلیل القدر منصب پر فائز رہنے کا حق نہیں۔ تو اب دیر کس بات کی' کیوں نہ اعلیٰ ترین سطح کا ایک کمیشن تشکیل دیا جائے جس میں عدلیہ کے علاوہ قومی پارلیمنٹ کو بھی نمائندگی حاصل ہو اور جو کم سے کم وقت میں اپنی تحقیقات کو مکمل کر کے اسے فوری طور پر بے کم و کاست عوام کے سامنے لانے کا بھی پابند ہو۔ ○○

قیمت ۶ روپے

انٹاریو (کینیڈا) سے ڈاکٹر محبوب عالم خواجہ نے لکھا ہے

سنو نیٹو سنو! انہیں بند کرو

ترجمہ : سردار اعوان

کیا مسلمانوں کی بقاء کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو بنیاد پرستی کی "تہمت" سے بچائیں' جبکہ یہ اصطلاح وضع ہی اس لئے کی گئی ہے کہ مسلمانوں پر دقیانوسیت اور شدت پسندی کا لیبل چسپاں کر کے انہیں عالمی تناظر سے نکال باہر کیا جا سکے۔ مغربی منصوبہ ساز ابلاغ جیسے خطرناک ہتھیار سے لیس ہیں جس کا ہمارے پاس کوئی توڑ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عالمی ذرائع ابلاغ اسلام اور مسلمان معاشرے کے بارے میں نئے نئے شوشے چھوڑتے رہیں اور ہم ان سے بدحواس ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے میں لگے رہیں۔ ٹائم رسالہ اپنی حالیہ اشاعت میں تحریر کرتا ہے کہ "شدت پسندی (بنیاد پرستی) ہمیشہ رہی ہے اور ہر جگہ رہی ہے"۔ مگر کیا شدت پسندی کا مقابلہ شدت پسندی سے کیا جانا چاہئے؟ بعض کور ذہن مسلمان حکمران اقتدار کے لالچ میں اپنے ہاں تصادم کو ہوا دے کر مغربی ذرائع کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم "مسلم بنیاد پرستی" سے نبرد آزما ہیں جسے مغربی ذرائع ابلاغ جدید سانچوں میں ڈھال کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جو نمایاں طور پر یہ ہیں۔

۱) مسلم دنیا میں سیاسی و سماجی انتشار پیدا کر کے اور احیائی تحریکوں کو زبردستی دہشت گردی کی طرف دھکیل کر اس کے معاشی استحصال کی راہ ہموار کرنا۔

۲) اپنے گرتے ہوئے معاشرے کو خوف زدہ کر کے مقامی مغربی تہذیب کے لیل و نہار میں گم رکھنا۔

ابلاغ عامہ کے کردار' اس کے اصل مقاصد اور طاقت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مغرب میں پالیسی سازی کا ذرائع ابلاغ پر اس درجہ انحصار ہے کہ پہلے جو مقاصد افواج کے ذریعے میدان جنگ میں حاصل کئے جاتے تھے وہ اب بہ تمام و کمال ابلاغ کو استعمال میں لا کر بہ آسانی حاصل کر لئے جاتے ہیں۔ وہی سامراجی عزائم اب بھی کار فرما ہیں جو پہلے تھے' صرف ہتھکنڈے بدلے ہیں۔ شکاری وہی ہیں' جال نئے ہیں۔ لیکن مسلم دنیا کا المیہ یہ ہے کہ اس میں شدید قحط الرجال ہے جس نے اسے دنیا میں یکہ و تنہا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کو درحقیقت ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت دہشت گردی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور شور یہ مچایا جا رہا ہے کہ یہ عالمی نظام کے لئے خطرہ ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ مغرب کا معاشی اور سیاسی نظام اس کے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد انہیں ہر حال میں ایک "خطرہ" چاہئے تھا' جس سے نبٹنے کے لئے وہ حسب سابق اپنی بھاگ دوڑ جاری رکھیں۔ لہٰذا انہیں اسلام اور مسلمانوں کی شکل میں بنا بنایا یہ خطرہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ مسلم ممالک میں ہنگامہ آرائی کا ماحول اور ہتھیار حاصل کرنے کا جنون مغرب کے معاشی اور سیاسی نظام کو تازہ خون فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ سٹیزن کے عیسائی مذہب کے ایڈیٹر' باب ہاروے کی طرف سے ایک حالیہ شمارے کے سرورق پر یہ سرخی لگائی گئی ہے۔ "کیا ہماری اقدار کا خاتمہ ہو رہا ہے ---- اقدار کا ہمارا تصور اتنا بگڑ چکا ہے کہ اگر اس کا کچھ کیا نہ گیا تو ہمارا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔" لیکن دنیا کے کسی کونے میں بھی اسلامی اقدار کو زندہ کرنے کی خواہش پائی جائے' یہ بات کسی طور بھی مغرب کے لئے قابل برداشت نہیں۔ عیسائی اور یہودی اپنے طرز زندگی اور اقدار کو قابل اطمینان سمجھتے ہیں' لیکن کیا وہ اسے بطور نظام اپنا کر دوسروں پر لاگو کرنا چاہتے ہیں؟ بظاہر اپنے مذہب اور اس کی بنیادی اقدار سے ان کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن عالمی پیمانے پر ------ دونوں ہی اپنے عقیدے اور اس کے وقار کے محافظ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ آئے روز جو نت نئے قضیئے مسلمانوں کے بارے میں پیدا کئے جاتے ہیں یہ اسی "دفاع" کا حصہ ہیں۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کی کرشمہ سازی کا کمال یہ ہے کہ اسرائیلی ریاست کا وجود ہی ایک باضابطہ اور منظم دہشت گردی کا مرہون منت ہے۔ شمالی آئرلینڈ میں کئی نسلوں سے پروٹسٹنٹس اور کیتھولکس کے درمیان جنگ جاری ہے۔ بھارت میں ہندو انتہا پسندوں نے مسلمان تو کجا' خود نچلی ذات کے ہندوؤں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے مگر عالمی ذرائع ابلاغ ان میں سے کسی کے بارے میں "بنیاد پرست" کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ گویا "بنیاد پرستی" صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی معیار مقرر نہیں۔ فلسطینی دہشت گرد اگر یہودیوں کی مطلب براری کے لئے کام میں لائے جا سکتے ہوں تو "روشن خیال" بن جاتے ہیں۔ افغانستان پر روسی قبضہ کے خلاف جہاد میں جانیں قربان کرنے والے مسلمان "مجاہدین" کہلانے کے حقدار تھے' آج انہی مجاہدین کو "جنگجو" اور "بنیاد پرست" قرار دیا جا رہا ہے کیونکہ مغرب کا ان سے کوئی مفاد وابستہ نہیں رہا۔ سابق یوگو سلاویہ سے متعلق خبروں میں آپ ہمیشہ "بوسنیا کی مسلمان سربراہ حکومت" کا نام سنیں گے لیکن سربوں کو کبھی بھول کر بھی عیسائی دہشت گرد نہیں کہا جاتا۔ کینیڈا کے دارالحکومت سے شائع ہونے والے مشہور روزنامہ "اٹاوہ سٹیزن" نے ایک تحقیقی رپورٹ شائع کی ہے جس کے مطابق لوگوں کو عیسائی مذہب پر اتنا یقین نہیں جتنا ابلاغ عامہ پر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ عالمی ذرائع ابلاغ اعلیٰ ذہنی قوت کو بروئے کار لا کر ایک سازش کے تحت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔

تاریخ پوچھے گی کہ کیا ہوا' مسلمانوں میں سلمان رشدی' صدام' مبارک' اسد' مس بھٹو اور الجزائری ڈکٹیٹری پیدا ہوئے۔ کوئی ایوبی' معتصم باللہ' قطب' مودودی' عبدالوہاب' اقبال اور شریعتی پیدا نہ ہوا۔ کیا مسلمان اسے مقدر جان کر آنکھیں بند رکھیں یا اوپر مسلط پٹھو حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ مغرب کو عوامی طاقت کا پورا شعور ہے۔ پیرس کے تھامس سینکٹن نے اسی کے پیش نظر کہا ہے (ٹائم ۷ فروری ۹۴ء) "بنیاد پرستوں کی کامیابی کو روکنا محال ہے۔" مغرب کے پروپیگنڈے سے قطع نظر' مسلم دنیا کے بیشتر حصوں میں احیاء اسلام کی جڑیں خاصی گہری ہیں۔ 'ٹائم' کے لارا مارلو اس ضمن میں الجزائر کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ موجودہ مسلمان حکمرانوں کا تادیر قیام بعید از قیاس ہے کیونکہ انہیں کہیں بھی عوام کی حمایت حاصل نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نوع انسانی اندھیروں میں بھٹکتی رہے اور آسمانی ہدایت پردوں میں لپٹی ہوئی نظروں سے اوجھل رہے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور

جلد ۴ شمارہ ۲۴

۱۳/ جون ۱۹۹۴ء

11

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرونِ پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۲ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۰ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰ " "

خداشناسی و خودشناسی

اطلاعات مظہر ہیں کہ امریکی دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بھارت نے اپنے پرتھوی میزائل کو تجربے کے مرحلے سے گزار لیا ہے جس کی مار ایک سو پچاس سے ڈھائی سو کلومیٹر تک ہے۔ یہ دور مار میزائل ایک ٹن تک وزنی بم اپنے ہدف تک لے جائے گا جو ایٹمی بھی ہو سکتا ہے۔ خیال ہے کہ یہ میزائل پاکستان کی سرحد کے قریب نصب کئے جائیں گے تاکہ دشمن گھر بیٹھے ہماری اہم تنصیبات اور بڑے شہروں کو نشانہ بنا سکے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ تجربہ چند ہفتے پہلے کیا جانا تھا جسے محض اس لئے موخر کیا گیا کہ بھارتی وزیر اعظم نرسمہا راؤ کو اپنے دورۂ امریکہ میں فوری ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والی ناگوار صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ اپنی بامقصد اور انتہائی کامیاب "بدیشی یاترا" سے جونہی واپس پہنچے، دور مار میزائل پروگرام کو سبز جھنڈی دے دی گئی۔

امریکہ کے اصرار اور دھمکیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ایٹمی دھماکہ کر گزرنے کا مشورہ حکومت پاکستان کو بھی دیا جا رہا ہے۔ انہی دنوں پاک فوج کے ایک سابق کور کمانڈر اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حمید گل کا جو بیان اخبارات میں شائع ہوا، اس میں کہا گیا ہے کہ ایٹمی دھماکہ کر دینے کے بعد بھارت کی طرح پاکستان بھی نیوکلیر کلب کا ممبر بن جائے گا جس کے بعد ہم بہت سی پابندیوں سے آزاد ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو وہ جواز ہے جو جنرل صاحب نے جوہری توانائی کے استعمال سے متعلق بین الاقوامی قواعد و ضوابط میں تلاش کیا ہے، قبل ازیں امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان، ڈاکٹر اسرار احمد نے اعلانیہ ایٹمی ہتھیار بنانے کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک اور مصلحت کا ذکر کیا تھا جو اول الذکر جواز سے بھی زیادہ اہم ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس اعلان اور عملی اقدام سے ہمیں لازماً امریکہ کی برہمی کا شکار ہونا پڑے گا جو اقتصادی ناکہ بندی سمیت کسی بھی شکل میں نمودار ہو سکتی ہے۔ گویا وہ کڑا وقت ہم پر آ ہی پڑے گا جس کے تصور سے ہم ہر دم سہمے رہتے ہیں، قوم اپنی تاریخ کی شاید سب سے بڑی آزمائش سے دوچار ہو جائے گی لیکن قومیں آزمائش کی بھٹی سے گزر کر ہی تو کندن بنا کرتی ہیں!

واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنی قوم کو بے حس، بزدل اور بے حمیت بنانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ورنہ اس کی غیرت کو للکارا جائے تو "نہیں اقبال ناامید اپنی کشت ویراں سے"۔ اس گئی گزری حالت میں بھی پاکستان کے غیرت مند مسلمان کسی بھی چیلنج کا مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ ٹکڑوں میں بٹی اور بکھری ہوئی اس قوم کو بنیان مرصوص بننے کے لئے شاید ایک ایسی ہی ابتلاء اور کسی ایسے ہی بحران کی ضرورت بھی ہے ۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول اس صورت میں ہمیں خدا یاد آئے گا، یعنی خداشناسی کی وہ نعمت عظمیٰ نصیب ہو گی جس کے نتیجے میں ہی خود شناسی کا جوہر بھی حاصل ہوا کرتا ہے اور یہ جوہر شاید جوہری توانائی سے بھی بڑے معجزے دکھا سکتا ہے۔ یہی تو وہ "خودی" ہے جسے بلند تر کر دینے پر اقبال کے الفاظ میں خدا بندے سے خود پوچھا کرتا ہے کہ "بتا تیری رضا کیا ہے؟"۔ اللہ کرے ہماری یہ کمزور آواز بھی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ سکے جو آج ملکی معاملات کے ذمہ دار ہیں۔ اس مسئلہ پر ہر کس و ناکس جو منہ میں آئے، کہہ رہا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے نازک اور حساس معاملے میں حد سے زیادہ رازداری برتی جاتی۔ ہماری ایٹمی صلاحیت کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ ہی گیا ہے تو ہم نے بھی جو بات ملک و قوم کے مفاد میں سمجھی، واجب جان کر عرض کر دی ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔ ○○

الہدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرہ
آیات ۱۹۰۔۱۹۱

اور جنگ کرو ان لوگوں سے اللہ کی راہ میں جو تم سے جنگ کرتے ہیں' اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا ○

(حج کے ذکر کے ساتھ ہی یہاں قتال فی سبیل اللہ کا حکم بھی آگیا کہ مدینہ میں مسلمانوں کو ایک مضبوط مرکز میسر آجانے کے بعد بیت اللہ کو مشرکین کے تسلط سے آزاد کرانا اب ان کی اولین ذمہ داری ہے اور مسلمانوں کو اب اجازت ہے کہ وہ اس راہ پر روڑے اٹکانے والوں کے خلاف مسلح جدوجہد کریں' جزیرہ نمائے عرب پر دین کے غلبہ و اقامت کی راہ اسی سے ہموار ہوگی۔ یہ جدوجہد اب اس مرحلے میں داخل ہوگئی ہے کہ اینٹ کا جواب اب پتھر سے دیا جائے گا اور باطل قوتوں کی سرکوبی کے لئے تلوار کا بھرپور استعمال ہوگا۔ ہاں' اے مسلمانو' زیادتی تمہاری طرف سے نہیں ہونی چاہئے کہ بوڑھوں اور بچوں کو ناحق قتل کرو یا حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے میں پہل کرو اسی بھی معاملے میں زیادتی کرنے والے کو اللہ دوست نہیں رکھتا)

اور قتل کرو ان کو جہاں کہیں پاؤ' اور نکالو ان کو وہاں سے جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا' اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے ○

(کہ یہ مشرکین عرب اگر راہ حق میں تمہارے مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو اور جہاں کہیں ان سے تصادم ہو وہیں انہیں قتل کرو' خواہ اس قتال کی ضرورت حدود حرم ہی میں پیش آجائے۔ مسلسل تیرہ برس تک نبی کی دعوت کے نتیجے میں ان پر اتمام حجت ہو چکا ہے اور اب یہ کسی رو رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ ان بدبختوں کو سرزمین حرم سے نکال باہر کرو جہاں سے کہ انہوں نے تمہیں نکلنے پر مجبور کیا تھا اور اگرچہ جنگ کرنا اور قتل و غارت گری کرنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن یاد رکھو کہ اللہ کے دین کے راستے میں روڑے اٹکانا اور ظلم و جبر سے کسی کو راہ حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنا قتل کے مقابلے میں کہیں بڑا جرم ہے!!)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے پاس جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں' پھر اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو قتل کر ڈالو ان کو' یہی بدلہ ہے کافروں کا ○

(یہ احتیاط ضرور ملحوظ رہے کہ حدود حرم میں جنگ کا آغاز تمہاری طرف سے نہ ہو۔ ہاں مشرکین اگر پہل کریں اور حرم کی حدود میں جنگ چھیڑیں تو وہیں ان کی خبر لو اور ان کی گردنیں اڑا دو۔ شعائر اللہ کی حرمت کو بٹہ لگانے والوں کی یہی سزا ہے!)

پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے ○

(کہ اس سب کے باوجود اگر وہ تائب ہو جائیں اور ایمان لے آئیں تو یہ راستہ ابھی ان کے لئے کھلا ہے' پھر ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی جائے گی بلکہ ان کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمے ہوگی اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا!)

داعیٔ تحریک ڈاکٹر اسرار احمد کے دوسرے خطبۂ خلافت کی تیسری اور آخری قسط

نظامِ خلافت میں غیر مسلموں کی حیثیت میں کوئی ابہام نہیں

مرتبہ : نثار احمد ملک

خلیفہ کا انتخاب

جدید عمرانی تصورات سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نفاذ کا ایک مرحلہ دستوری ہے۔ آپ نے اپنے ملکی دستور میں لکھ دیا کہ ہر شے پر قرآن و سنت کی بالادستی ہوگی۔ گویا اس ملک میں کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے منافی نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس دستوری مرحلہ کو طے کرنے کے بعد اب اس حاکمیت کے نفاذ کا حقیقی مرحلہ ہے جو ابھی طے کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ ہے "یایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شی ء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر و احسن تاویلا۔" اس آیت کریمہ میں اعجاز قرآنی کے کئی پہلو جمع ہو گئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ "اطیعوا" کا فعل امر اللہ کے ساتھ بھی ہے اور رسول کے ساتھ بھی لیکن "اولی الامر" کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی تھی کہ "اطیعوا اللہ ورسولہ واولی الامر منکم۔" اس طرح بریکٹ کے باہر کی رقم بریکٹ کے اندر کی ساری چیزوں سے ضرب کھا جاتی ہے۔ یعنی اطاعت کرو اللہ کی اس کے رسول کی اور اپنے "اولی الامر" کی۔ لیکن دو کے ساتھ فعل امر ہے جبکہ ایک کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دو کی اطاعت مستقل بالذات ہے' مطلق ہے جبکہ تیسرے کی اطاعت مطلق نہیں بلکہ ان دو اطاعتوں کے تابع ہے۔

دوسری بات اس آیت مبارکہ میں یہ بتائی گئی کہ "فان تنازعتم فی شی ء فردوہ الی اللہ والرسول" یعنی اب اگر کسی معاملے میں تمہارا جھگڑا ہو گیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ ظاہر ہے یہ جھگڑا "اولی الامر" سے ہو گا مثلاً اولی الامر میں سے کوئی یہ کہتا کہ جو حکم میں دے رہا ہوں یہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر ہے' تمہارا دماغ خراب ہے کہ جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب و سنت سے تجاوز ہے۔ ایک شہری کی حیثیت سے میں صاحب امر کو چیلنج کر سکتا ہوں کہ آپ کا یہ عمل شریعت کے دائرے سے تجاوز ہے۔ اب اس مسئلہ کا حل کہاں ہے؟ ہم طے کرانے کہاں جائیں گے؟ اس آیت کی روشنی میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کریں گے۔ لیکن نہ اللہ ہمارے سامنے موجود ہے نہ رسول اس وقت موجود ہیں!! میں پورے شعور کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ اس آیت مبارکہ میں دو خلا ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں توہین کا پہلو نہیں ہے۔ یہ دو خلا اللہ تعالیٰ نے یہاں حکمت کے تحت چھوڑے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آیت ہے کہ "اے مسلمانوں جب قرآن نازل ہو رہا ہو تو سوال مت کیا کرو" اللہ تعالیٰ نے اگر کوئی بات مجمل چھوڑی ہے تو اس میں بھی کوئی نہ کوئی عظیم حکمت پوشیدہ ہو گی۔ لہٰذا تم سوالات کے ذریعے خواہ مخواہ اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کر لو گے۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ حج کی فرضیت کے حوالے سے ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور حضور ﷺ سے پوچھنے لگے کہ حضور ﷺ کیا ہر سال حج فرض ہے؟ اس پر حضور ﷺ خاموش رہے اور روئے انور دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ صحابی پھر تشریف لے آئے اور کہا کہ حضور ﷺ کیا حج ہر سال فرض ہے؟ حضور ﷺ نے ان صحابی کو ڈانٹ پلا دی کہ اللہ کے بندے اللہ نے ایک چیز کو مجمل رکھا ہے' تمہارے لئے باعث رحمت ہے اگر میں کہہ دوں کہ ہر سال فرض ہے' تو ہر سال کرو گے اور میں کہہ دوں گا تو فرض ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں پہلا خلا یہ ہے کہ "اولی الامر" کہاں سے آئے گا؟ حضور ﷺ نے کسی کو نامزد نہیں کیا جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک کمیٹی بنائی۔ اس طرح ہمارے سامنے سب کی مختلف مثالیں آ گئی ہیں۔ اس ضمن وہ مسئلہ بھی سمجھ لینا چاہئے جو ہمارے فقہاء نے بیان کیا ہے او جس پر ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے دانشور فقہا و علماء پر پھبتیاں چست کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ "متغلب" کی امامت کا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ بابر آتا ہے اور ابراہیم لودھی کو شکست دے کر حکومت و اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے۔ اب اس کو کسی نے چنا ہے؟ کیا کسی کے مشورے سے آیا ہے؟ وہ "متغلب" ہے' اس نے خود غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن فقہاء نے کہا ہے کہ اس کی اطاعت بھی جائز ہے بشرطیکہ اس کا حکم کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر ہو۔ اگر آپ "متغلب" کی اطاعت کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر وقت بغاوت جاری رہے۔ عہد حاضر میں بھی "نظریہ ضرورت" کے تحت عدالت عظمیٰ مارشل لاء کو تسلیم کرتی ہے۔ ظاہر ہے عدالت کے پاس فوج کو ہٹانے کی طاقت نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے "اولی الامر" کا معاملہ کھلا رکھا ہے۔ ایک بات واضح کر دی کہ یہ "اولی الامر" تم میں سے ہونے چاہئیں۔ آئیڈیل صورت یہی ہے کہ تمہارے مشورے سے آنے چاہئیں۔ قرآن حکیم نے یہ اصول دے دیا ہے کہ "امرھم شوری بینھم"

سورۂ نساء کی مندرجہ بالا آیت میں دوسرا خلا یہ ہے کہ فرض کریں اگر کسی کا خیال یہ ہو کہ صاحب امر کی رائے قرآن و سنت کے منافی ہے' اب ایک طرف

"اولی الامر" ہے اور دوسری طرف عام شہری ہے' فیصلہ کون کرے گا؟ ظاہر ہے کوئی تیسرا فرد' ایجنسی یا ادارہ ایسا ہونا چاہئے جو اس بات کا فیصلہ کرے۔ عہد حاضر کے جدید "سٹیٹ کرافٹ" میں عدلیہ نے اس خلا کو پر کیا ہے۔ ملکی دستور میں یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ کوئی قانون سازی کتاب و سنت کے منافی نہیں ہوگی۔ ملکی پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے' پارلیمنٹ کی رائے میں یہ قانون قرآن و سنت کے دائرے کے اندر اندر ہے لیکن ایک عام شہری یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب اس شہری کو ثابت کرنا ہوگا کہ کتاب و سنت سے تجاوز ہوا ہے۔ اب یہ شہری کہاں جائے گا؟ یہ شہری عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا' اس لئے کہ عہد حاضر میں دستور کی محافظ عدلیہ ہوتی ہے۔ دستور کے ذریعے مہیا کئے گئے بنیادی شہری حقوق کی محافظت بھی عدالت عالیہ کی ذمہ داری ہے۔ ایک شہری عدالت میں جاکر کسی ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کے خلاف رٹ دائر کر سکتا ہے کہ اس نے میرے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں دو خلا موجود ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ خلا حکمت کے تحت رکھے گئے ہیں۔ اب اس حکمت کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔ نزول قرآن کے وقت ابھی Process of Social Evolution چل رہا تھا۔ اس وقت تک ابھی لوگ ریاست اور حکومت کے فرق تک کو نہیں سمجھتے تھے۔ ریاست کے "سٹیٹ کرافٹ" کے تین گوشے نوع انسانی پر ابھی منکشف ہونے تھے لہٰذا قرآن حکیم نے ان تمام چیزوں کو "Acomodate" کرنے کے لئے خلا چھوڑ دیا۔ اگر تمام باتیں پہلے سے طے کر دی جاتیں تو شاید ہم زمانے کا ساتھ نہ دے سکتے۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ چین میں یہ روایت تھی کہ عورتوں کے پاؤں چھوٹے ہونے چاہئیں۔ ممکن ہے کہ نسوانی حسن کا تقاضا ہو۔ چینی لوگ بچپن میں بچی کو لوہے کی جوتی پہنا دیتے تھے۔ اب اس جوتے کی وجہ سے پاؤں میں بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی تھی۔ اسی طرح اگر آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں ریاست و حکومت سے متعلق تفصیلی احکامات دے دیئے جاتے تو یہ لوہے کا جوتا ثابت ہوتے۔ اس لئے کہ یہ اللہ اور رسول کی طرف سے آخری بات ہوتی جس کو چیلنج نہ کیا جا سکتا۔ لیکن لوہے کی بجائے ربڑ کا جوتا پہنایا گیا ہے تاکہ پاؤں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جوتا بھی بڑھتا چلا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ آج قرآن و سنت عمرانی ارتقاء کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے میں حائل نہیں ہیں۔

اس خلا سے ایک طرف یہ بات طے کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی کہ "اولی الامر" کا چناؤ کیسے ہو۔ ظاہر ہے یہ معاملہ عہد حاضر میں انتخابات کے ذریعے طے ہوگا۔ اس خلا سے ہی یہ بھی طے ہوا کہ پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر کہاں پرکھا جائے گا۔ یہ معاملہ عدالت میں طے ہوگا۔ اگر عدلیہ یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ قرآن و سنت سے تجاوز نہیں ہوا تو اس صورت میں ہمیں پسند ہو یا ناپسند' پارلیمنٹ کا قانون تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ اس لئے تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ معاملہ مباحات میں سے ہے اور مباح کا حکم دینے کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہوگا۔ یہ مسئلہ کہ اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا انتہائی سادہ ہے۔ ہمارے بعض جدت پسند اور مغرب گزیدہ دانشوروں نے خواہ مخواہ اسے چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے۔

البتہ انتخابات کا معاملہ کسی قدر پیچیدہ ہے۔ الیکشن کے نظام کو اسلامی ریاست میں کچھ حدود و قیود کا پابند کرنا ہوگا لیکن روح عصر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ "Broad Base" ہونا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی رائے کا اس میں عمل دخل ہونا چاہئے۔ اس ضمن میں بھی میں سید الطائفہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ "المسلم کفو لکل مسلم" یعنی قانونی و دستوری حقوق کے اعتبار سے تمام مسلمان برابر ہیں۔ اسلامی ریاست میں ایسا نہیں ہوگا کہ ایک مسلمان متقی ہے لہٰذا اس کے قانونی و دستوری حقوق زیادہ ہیں اور ایک فاسق و فاجر مسلمان کے حقوق کم ہیں۔ یہ بات بہت ہی اہم ہے لیکن کسی قدر مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ میرے پاس اس عقدے کی گرہ کشائی کے لئے ایک چابی ہے۔ جس سے یہ گرہ فوراً کھل جائے گی۔ اس بات کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے کہ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ پرہیزگار' تہجد گزار ہے جبکہ دوسرا پانچ وقت کی نماز بھی نہیں پڑھتا۔ ان کا باپ فوت ہو جاتا ہے۔ باپ کی وفات کے بعد وراثت دونوں کو برابر ملے گی۔ ایسا ممکن نہیں کہ متقی کو زیادہ مل جائے اور فاسق و فاجر کو کم ملے۔ لیکن اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے کہ اس کی تکفیر ہو جائے' اب اس کے سارے حقوق زیرو ہو گئے ہیں۔

جب کہ مسلمان رہا تو حقوق سو فی صد حاصل رہے کافر ہو گیا تو تمام حقوق ختم ہو گئے۔

اسلامی ریاست میں ووٹ دینے کا حق تمام مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ یہ بات اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ روح عصر کا بھی تقاضا ہے کہ Maximum number of the people should feel that they are participating in this system. البتہ ووٹرز پر کچھ نہ کچھ قیود تو لگانی پڑتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ووٹر کی عمر کتنی ہو' بیس سال کا ہو' اکیس کا ہو' کتنا ہو؟ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ ووٹر کی عمر چالیس سال ہونی چاہئے۔ یہ بات میں بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ قرآن مجید میں کوئی حکمت ہے جو کہا ہے کہ "حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنہ" اگر ووٹر کی عمر چالیس سال نہیں کی جا سکتی تو کم از کم الیکشن میں حصہ لینے والے کی عمر چالیس سال ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن یہ تمام چیزیں مباحات کے دائرے میں آتی ہیں اور باہمی مشورے سے طے کی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ باہمی مشورے سے تعلیم کی بھی کچھ نہ کچھ شرط عائد کر دیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ یہ تقویٰ وغیرہ ناپے جانے والی چیزیں نہیں ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے تعلیم کا' یہ پھر بھی ناپی جا سکتی ہے لیکن کیا معلوم کہ جو تقویٰ کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے اندر سے اس کی حقیقت کیا ہے۔

اسلامی ریاست میں جو لوگ الیکشن میں حصہ لینا چاہیں گے ان کے لئے یقیناً باریک چھلنیاں لگائی جائیں گی۔ انہیں اپنے کردار کا ثبوت دینا ہوگا' خصوصاً مالی معاملات کی صفائی پیش کرنی ہوگی۔ یہ بتانا ہوگا کہ اس کے پاس کتنا مال ہے اور کہاں سے کمایا ہے۔ اسلامی عدالت میں ہر شخص گواہ بن کر نہیں جا سکتا۔ اسے پہلے اپنا کردار ثابت کرنا ہوگا۔ اسے "تزکیۃ الشہود" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عدلیہ کے ان تمام اصولوں کو ہم ووٹر اور الیکشن لڑنے والے امیدوار کی شرائط میں بھی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ اس سے غلط لوگوں کے آنے کا راستہ تنگ ہو جائے گا۔ میں نے یہ اصولی باتیں کی ہیں البتہ عملی صورت میں باہمی مشورے سے تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ منتخب نمائندگان کے لئے مواخذہ کا ایک موثر نظام بنانا ہوگا۔ یہ نظام اس لئے ضروری ہے کہ منتخب ہو کر آنے والے ابوبکرؓ اور عمرؓ

نہیں ہیں' جن کے بارے میں ہمیں کسی بددیانتی اور خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔ خلفاء راشدین کا تزکیہ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ مواخذہ کا یہ نظام عہد حاضر میں ترقی یافتہ ممالک میں کافی موثر ہے۔ چنانچہ امریکہ میں صدر نکسن کے خلاف مواخذہ کی تحریک ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ وہ از خود مستعفی ہو گیا تھا۔ امریکہ میں آئین نے صدر کو جہاں بہت زیادہ اختیارات دیئے ہیں وہیں Checkes and Balances کا نظام بھی بہت سخت ہے۔ جدید اسلامی ریاست کے دستور میں یہ تمام چیزیں شامل کی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے یہ اصول طے کیا ہے کہ ہر وہ چیز جو اسلامی فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے اسے اختیار کیا جائے گا۔

جیسا کہ یہ بات اس سے پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ دستور پاکستان نے اسلامی ریاست کے لئے پہلے دستوری تقاضے کو قرار داد مقاصد کے ذریعے پورا کر دیا ہے۔ اگرچہ اس کو باقاعدہ دستور کا حصہ بننے میں بہت وقت لگا ہے۔ یہ دفعہ کہ "No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah" ہر دستور میں موجود رہی ہے۔ اس دفعہ نے دستوری سطح پر "لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ" کے تقاضے پورے کر دیئے۔ لیکن اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اسے Directive Principles میں رکھا گیا لہٰذا غیر موثر رہی ہے۔ آپ اس کی بنا پر عدالت میں کوئی دعویٰ دائر نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی دستوری تاریخ میں پہلی مرتبہ ضیاء الحق مرحوم نے اس ضمن میں قدم اٹھایا اور اس کو دستور کے دیباچے سے نکال کر دستور کی باقاعدہ ایک دفعہ بنا دیا۔

ضیاء الحق مرحوم نے جہاں اس قرار داد کو دستور کا جزو لاینفک بنایا وہیں دستور میں جو چیزیں اس کے منافی تھیں ان کو بھی رہنے دیا۔ اسی لئے ہمارے ہاں عجیب تماشے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک عدالت عالیہ نے قرارداد مقاصد کی بنیاد پر ایک فیصلہ دیا جبکہ سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو کسی دوسری دفعہ کی بنیاد پر Reverse کر دیا۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ جب یہ دفعہ دستور کا حصہ بن گئی ہے تو اس کے منافی دفعات کو دستور سے کھرچ دیا جاتا۔

ضیاء الحق مرحوم نے دستوری سطح پر اسلام کی طرف پیش رفت کے ضمن میں ایک اور کام بھی کیا لیکن انتہائی نیم دلی کے ساتھ کیا۔ اگرچہ یہ پیش رفت صحیح سمت میں تھی لیکن تمام تقاضے پورے نہیں کئے گئے۔ وہ پیش رفت وفاقی شرعی عدالت کا قیام تھا۔ اگر کسی شہری کا خیال ہے کہ کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی ہے' وہ عدالت میں جائے اور ثابت کرے۔ لیکن نیم دلی کا مظہر وہ قیود ہیں جو اس عدالت پر عائد کی گئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کے لئے علیحدہ عدالت بنائی گئی حالانکہ یہ عدالت عدلیہ کے پورے نظام کے ساتھ ہی ہونی چاہئے تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس عدالت کا درجہ دوسری عدالتوں سے کم رکھا۔ اس کے ججوں کو Dismiss بھی کیا جا سکتا ہے نیز ان کا درجہ بھی دوسرے ججوں سے کم ہے۔ اس دفعہ کو فیڈرل شریعت کورٹ کے حوالے کیا لیکن اس عدالت کے ہاتھوں میں دو ہتھکڑیاں اور پاؤں میں دو بیڑیاں بھی پہنا دیں۔ پہلی ہتھکڑی یہ ہے کہ دستور پاکستان اس عدالت کے دائرے سے باہر ہے اور دوسری ہتھکڑی یہ پنہا دی کہ Judicial Laws اس کے دائرے سے باہر ہیں۔ اس کے علاوہ دو بیڑیاں یہ تھیں کہ مالی قوانین اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں نیز عائلی قوانین کے بارے میں بھی اس عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا جا سکتا۔

یہ ساری پیش رفت عملی اعتبار سے بے کار ثابت ہوئی۔ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ تفاصیل عائلی قوانین کے بارے میں موجود ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ انگریز نے بھی اپنے دور حکومت میں ان قوانین کو نہیں چھیڑا۔ بھارت کے مسلمان نے اپنے عائلی قوانین کو تحفظ دلوایا ہے لیکن ہمارے ملک میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ایک منکر حدیث کے بنائے ہوئے قوانین نافذ کئے۔ اس کے گیارہ سالہ دور میں نافذ رہے اور آج تک نافذ ہیں۔ البتہ ایک ہتھکڑی ایک مقرر وقت تک کے لئے تھی۔ دس سال پورے ہونے کے بعد کھل گئی ہے لہٰذا وفاقی شرعی عدالت نے وہ تاریخی فیصلہ دے دیا ہے کہ بینک کا سود بھی ربو ہے۔ میرے نزدیک یہ قرارداد مقاصد کے درجے کا اہم فیصلہ ہے لیکن آئی جے آئی کی حکومت نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی ہے۔

یہ گلا جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
جو میں بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری
ہری

اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کر رہا ہوں کہ کہنے کو تو آسان ہے کہ یہ دفعہ دستور میں شامل کر دی جائے لیکن یہ بہت کڑوی گولی ہے جسے ہضم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

اب ہم تیسری چیز کی طرف آتے ہیں کہ جسے دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام میں شامل کر کے اسے خلافت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ تیسری چیز مخلوط قومیت کی نفی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت "Protected Minorty" کی ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شہری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بہت ہی کڑوی گولی ہے' اسے نگلنا اور ہضم کرنا آسان نہیں ہے۔ عہد حاضر میں پوری دنیا کی سیاست کی گاڑی "سیکولرزم" اور "نیشنلزم" کے دو اصولوں پر چلتی ہے۔

گویا مذہب اور سیاست کی کامل علیحدگی وجود میں آ چکی ہے۔ مذہب ایک شہری کا انفرادی معاملہ ہے جبکہ سیاست' معیشت اور سماجی و عائلی نظام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک ملک میں رہنے والے تمام افراد برابر کے شہری ہیں۔ یہاں یہ بات نوٹ کر لینی چاہئے کہ نظری طور پر برابر کے شہری ہیں ورنہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں گوروں اور کالوں کے درمیان جو فرق و تفاوت کی خلیج حائل ہے اسے کون نہیں جانتا۔ اسی طرح بھارت میں جو دنیا کا سب سے بڑا سیکولر ملک ہونے کا مدعی ہے' شودر اور برہمن کے فرق سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ بھارت میں یہی معاملہ مسلم اور غیر مسلم کا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریاتی طور پر بھارتی دستور بھی یہی کہتا ہے کہ ہر شخص برابر کا شہری ہے۔

عہد حاضر کے پرفریب افکار و نظریات میں سے ایک یہ "برابر شہری" ہونے کا تصور ایسا ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی اور تصور کو قبول کرنا نہایت کٹھن ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ لازمی ہے کہ اگر آپ نظام خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں تو مخلوط قومیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اس موقع پر یہ بات بھی نوٹ کر لینی چاہئے کہ پاکستان کی ماں ہی "جداگانہ قومیت" ہے۔ پاکستان وطنی قومیت کی نفی کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ مسلم لیگ کا کانگرس کے ساتھ جھگڑا ہی یہ تھا کہ مسلمان جداگانہ قومیت رکھتے ہیں جبکہ کانگرس کا موقف تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد' ہندو' مسلم' سکھ' پارسی اور عیسائی ایک قوم ہیں۔ اس کے جواب میں ہم نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے'

ہماری قومیت ہمارے مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے اسلامی ریاست میں غیر مسلم کی حیثیت ذمی کی ہے۔ بدقسمتی سے مغرب نے ہمارے ساتھ بہت بڑا داؤ کھیلا ہے کہ ہماری ہر وہ چیز جو اسے پسند نہیں تھی اسے گالی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کا المناک پہلو یہ ہے کہ اس گالی کو مغرب نے اتنا اچھالا ہے کہ اپنے بھی کہنے لگے کہ ہم کب کہتے ہیں ہم پر تو یہ خواہ مخواہ کی تہمت ہے! ذمی در حقیقت ذمہ سے بنا ہے۔ گویا اسلامی ریاست یا نظام خلافت غیر مسلموں کی جان' مال' عزت اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔ ایک اعتبار سے تو ذمی مسلمان کو بھی کہا گیا ہے۔ نبی اکرمؐ نے ایک مسلمان کی کم سے کم شرائط بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ "فذلک المسلم الذی له ذمة الله وذمة رسوله" یعنی ہر وہ شخص مسلم ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ نظام خلافت میں غیر مسلموں کو کون سے حقوق حاصل ہیں اور کہاں کہاں ان پر تحدید ہے۔ پہلے ہم غیر مسلموں پر عائد بندشوں کو بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ غیر مسلم خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عہد حاضر میں بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ دستوری سطح پر طے ہو جاتا کہ فلاں ریاست کا سربراہ مسلمان ہو گا یا عیسائی ہو گا۔ یہ اس ملک کے سرکاری مذہب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ خلافت اگرچہ اللہ نے پوری نوع انسانی کو دی تھی لیکن نوع انسانی میں سے جو حاکمیت کے مدعی بن کر کھڑے ہو گئے ان کا حق خلافت چھین لیا گیا ہے لہٰذا اب خلافت صرف مسلمانوں کی ہے۔ اس فلسفیانہ بنیاد پر خلیفہ غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔ دوسری پابندی یہ ہو گی کہ عہد حاضر کے نظام خلافت کی مقننہ کا رکن کوئی غیر مسلم نہیں بن سکے گا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہیں بن سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نظام خلافت میں قانون سازی کا دارو مدار کتاب وسنت پر ہے لہٰذا جو شخص نہ کتاب اللہ کو مانے نہ سنت کو مانے وہ قانون سازی میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ تیسری پابندی یہ ہو گی کہ ریاست کے پالیسی بنانے والے اہم اداروں کی رکنیت بھی غیر مسلم کو نہیں دی جائے گی۔ یہاں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں رکن نہیں بن سکتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اب جب کبھی نظام خلافت دنیا میں قائم ہو گا تو اس کی Top most Policy یہ ہو گی کہ اس نظام کو پوری دنیا میں پھیلانا ہے۔ آپ خود سوچئے کہ کیا غیر مسلم اس پالیسی کی تشکیل اور نفاذ میں معاون ومددگار بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس نظریاتی بنیادوں پر قائم نظام خلافت کے قائل ہی نہیں ہیں لہٰذا وہ تو اس کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ تین ادارے غیر مسلم کے لئے Out of Bounds ہیں۔

اب ہم ان حقوق کو زیر بحث لاتے ہیں جو نظام خلافت کے تحت غیر مسلموں کو حاصل ہوں گے۔ پہلی بات یہ کہ نظام خلافت میں غیر مسلموں کی جان' مال' عزت و آبرو اتنی ہی محفوظ ہو گی جتنی کہ کسی مسلمان کی ہوتی ہے۔ گویا اس میں مسلم اور غیر مسلم میں سرے سے کوئی فرق ہو گا ہی نہیں۔ دوسرا حق یہ ہو گا کہ مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ تیسری بات یہ کہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت مساجد سے بڑھ کر کی جائے گی۔ اس تیسری بات پر آپ چونکیں ہوں گے کہ مسجد سے بڑھ کر مقام کسی اور عبادت گاہ کا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے پاس ایک دلیل قرآن حکیم سے ہے اور دوسری دلیل خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق ؓ کے عمل سے ہے۔ سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ "ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوت ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا" یعنی اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً کچھ لوگوں کے ذریعے کچھ لوگوں کو ختم کرتا رہتا ہے تو یہ خانقاہیں' گرجے' عبادت گاہیں اور مسجدیں منہدم ہو جاتیں۔ اس آیت مبارکہ میں دوسری عبادت گاہوں کا ذکر پہلے ہے جبکہ مسجد کا ذکر آخر میں ہے۔ دوسری دلیل حضرت عمر فاروق ؓ کا وہ عمل ہے جو بیت المقدس کی فتح کے وقت سامنے آیا۔ آپؓ گرجا میں تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ کو کہا گیا کہ یہیں نماز ادا فرما لیجئے' ابھی مصلی منگوائے دیتے ہیں۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں' اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان اسے مسجد بنا لیں گے۔ آپ وہاں سے باہر نکلے اور اس جگہ پر نماز ادا کی جہاں بعد میں مسجد عمر تعمیر ہوئی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ نظام خلافت میں غیر مسلموں کو Personal Law کی مکمل آزادی ہو گی۔ چنانچہ شادی بیاہ' نکاح و طلاق اور وراثت کا نظام اپنے مذہب کے مطابق طے کریں گے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ اپنی آنے والی نسل کو اپنا مذہب جس طرح چاہیں پڑھائیں۔ البتہ مسلمانوں میں تبلیغ کی اجازت نہیں ہو گی۔ چھٹی بات یہ کہ تجارت اور صنعت وحرفت پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ غیر مسلموں کے لئے پورے مواقع ہوں گے کہ وہ اپنی اہلیت کی بنیاد پر سرکاری ملازمتیں حاصل کریں۔ اگرچہ اس ضمن میں پالیسی تشکیل دینے والے ادارے مستثنیٰ ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر محکمہ میں ایک اعلیٰ ترین سطح وہ ہوتی ہے جہاں پر Grand Policy بنائی جاتی ہیں۔ اس بلند تر سطح پر تو پابندی ہو گی اگرچہ اس سے نیچے تمام شعبوں میں ملازمت کے مواقع غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں کی طرح حاصل رہیں گے۔

غیر مسلموں کے حوالے سے ایک آخری لیکن انتہائی اہم بات یہ ہے کہ صدارتی نظام میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ کسی ایسے شخص کو وزارت دی جائے جو مقننہ کا رکن نہیں ہے۔ چنانچہ صدارتی نظام میں کسی ٹیکنیکل شعبے کے لئے کسی غیر مسلم کو بھی جو اس شعبے کا ماہر ہو' وزیر بنایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ نظام خلافت کے تحت اسلامی ریاست کا باقاعدہ شہری مسلمان ہی ہو گا۔ نظام خلافت غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کے باوجود ان پر بعض پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس پر جدت پسند لوگ یہ پھبتی بھی چست کریں گے کہ اس طرح تو وہ Second rate citizen بن کر رہ جائیں گے۔ میں نے اس مسئلے میں اسلام کی پوزیشن واضح کر دی ہے اور اس پر مجھے ہر طعنہ قبول ہے۔

یہاں جزیہ کے حوالے سے بھی چند باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔ آج جزیہ کو بھی گالی بنا دیا گیا ہے۔ جزیہ جزا سے بنا ہے۔ ہمارے ہاں جتنا بھی Texation کا نظام ہے یہ جزیہ ہی تو ہے۔ اسلامی نظام خلافت میں مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی لیکن غیر مسلموں سے زکوٰۃ تو وصول نہیں کی جا سکتی بلکہ ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ظاہر ہے وہ اس ملک کا شہری ہے اور ریاست نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ ریاست جو ذمہ داری لے رہی ہے اس پر اس سے ٹیکس وصول کرے گی۔ وہ ٹیکس جزیہ ہے۔ بدقسمتی سے یہ تمام چیزیں ہماری نگاہوں سے اوجھل اس لئے ہو گئی ہیں کہ آج پوری دنیا میں مسلمان خود جزیہ دے رہا ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں جو ٹیکس کا نظام رائج ہے اسے ہم زکوٰۃ تو نہیں کہہ سکتے' اسے

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

سکھر میں تنظیم فکر و نظر سندھ کے زیر اہتمام

دو روزہ خلافت راشدہ کانفرنس

رپورٹ : پروفیسر اصغر مجاہد مہر

تنظیم فکر و نظر سندھ کی طرف ایک عظیم الشان دو روزہ خلافت راشدہ کانفرنس تنظیم کے مرکزی دفتر سندھ اسلامک سینٹر مینارہ روڈ سکھر میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئی جس میں سندھ کے مختلف مکاتب فکر و مسالک سے تعلق رکھنے والے' مساجد کے خطیب اور مدارس کے نامور جید علماء کرام اور دانشور حضرات کی بھاری تعداد نے شرکت فرما کر اپنی دینی حس و حمیت کا ثبوت فراہم فرمایا۔ سکھر اور لاڑکانہ ڈویژنوں کے تقریباً سب اضلاع کی بھرپور شمولیت و نمائندگی نظر آ رہی تھی۔ حتیٰ کہ حیدر آباد سے سندھ یونیورسٹی مسلم ہسٹری کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ممتاز محقق دانشور ڈاکٹر پروفیسر عبدالستار انصاری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ کانفرنس سے پہلے علامہ ڈاکٹر اسرار احمد کے اعزاز میں عشائیہ کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا' جس میں شہر کے معززین عمائدین کے علاوہ ریلوے ڈی ایس سکھر جناب جلال الدین ایڈو' مزدور لیڈر رحیم بخش مہر' ریٹائرڈ میجر ملک محمود' جمعیت علماء سندھ کے صدر مولانا عبیداللہ بھٹو اور جنرل سیکرٹری مولانا عبداللہ لغاری' خواجہ جلیل احمد ایڈوکیٹ' جناب شیخ عبدالستار ایڈوکیٹ' مولانا عبیداللہ بھٹو ابن آزاد اور جیئے سندھ کے رہنما لالا اسد پٹھان اور مولانا شفیع محمد انڈھڑ نے شرکت فرمائی۔ اس تقریب میں سوالات و جوابات کی نشست بھی تھی۔

خلافت راشدہ کانفرنس کا آغاز بعد نماز مغرب اللہ تبارک و تعالیٰ کے کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے فرائض حافظ مولوی منیر احمد نے انجام دیئے۔ کانفرنس کی صدارت سندھ کے مایہ ناز عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد مراد ہالیجوی نے فرمائی جبکہ مہمان خصوصی عالم اسلام کے عظیم مدبر عالم دین و مفسر قرآن' امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت پاکستان حضرت علامہ ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔ ڈاکٹر موصوف کافی عرصے کے بعد سکھر تشریف لائے تھے۔ ان کے معتقدین کا جم غفیر ان سے ملنے' ان کو دیکھنے اور ان کو سننے کے لئے بے چینی سے ان کی آمد کا منتظر تھا۔ صدر تنظیم جناب پروفیسر اسد اللہ بھٹو کی سربراہی میں قبل ازیں ایک وفد ان سے ملنے اور سکھر کے لئے ان کی خدمت میں درخواست دعوت عرض کرنے کے لئے گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو جب دعوت دی گئی تو انہوں نے بڑی شفقت سے نہ صرف دعوت کو قبول فرمایا بلکہ تنظیم اسلامی حلقہ سندھ کے ممتاز رفیق' جناب غلام محمد سومرو کو اس روح پرور پروگرام کے لئے ہر طرح سے تنظیم فکر و نظر سندھ کے ساتھ تعاون کی ہدایت بھی فرمائی۔ جناب غلام محمد سومرو نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں اور اپنے ذاتی تعاون اور تنظیمی اثر و رسوخ سے بڑا اہم کردار ادا کیا اور کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہمارے ہم رکاب رہے۔ علامہ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے مخصوص بصیرت و ایمان افروز ولولہ انگیز خطاب میں فرمایا کہ خلافت راشدہ ایسا نظام حکومت ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ڈاکٹر صاحب نے کئی قرآنی آیات و احادیث مبارکہ کے حوالوں سے بتایا کہ مجھے کامل یقین ہے کہ خلافت منہج نبوی کا عروج ہے اور آ کر رہے گا۔ انہوں نے کہا اگر احادیث مبارکہ میں اس کا بیان نہ ہوتا تو میں یہ کبھی نہ مانتا کہ یہ مبارک دور پھر برپا ہوگا۔ خلافت راشدہ کا دور اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ کے سچے ساتھیوں اور صحابیوں کے مبارک ہاتھوں سے برپا ہوا تھا اس لئے خلافت راشدہ کا آنا تو اب ناممکن ہے کیونکہ اب کوئی صحابی رسول ﷺ موجود نہیں ہے تاہم احادیث مبارکہ میں خلافت منہج نبوی ﷺ کے قائم ہونے کی بین دلائل موجود ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ زمین کی خلافت مومنین و مصلحین کو ملے گی۔ یہ وعدہ صرف اہل ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لئے ہے اور انہیں کو خلافت ملے گی۔ اگر ہم خلافت کے متمنی اور طالب ہیں تو ہمیں سنت نبوی ﷺ اور سیرت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین خصوصاً خلفاء راشدین رضوان اللہ اجمعین کے تعامل اور طرز عمل کو اپنانا پڑے گا تب ہم خلافت ارضی کے اہل بن سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خلافت راشدہ کے مبارک دور میں ہی اللہ تعالیٰ کے دین کا غلبہ ہوا' نبوی ﷺ کی ترویج و ترقی ہوئی اور یہ نظام حکومت پوری طرح سے عدل و انصاف کا نمونہ تھا جب اس مبارک منہج سے ہم ہٹے تو ملوکیت نے تباہی مچا دی۔ اس وقت سے مسلمان انتشار و افتراق کے عذاب میں مبتلا ہیں اور آج تک سزا بھگت رہے ہیں۔ عدالتیں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں اور ہمارے دستور میں سودی معیشت کو چلانے کی اجازت دی گئی ہے جبکہ قرآن حکیم نے سود کے لینے و دینے والے کو کرنے والا کہا ہے۔ آج بھی جو لوگ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ یقیناً کافر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خبردار کیا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آئیں۔ یہود و نصاریٰ ہرگز مسلمانوں کے دوست اور خیر خواہ نہیں بلکہ قرآن حکیم کے مطابق یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے دوست و مددگار ہیں کیونکہ وہ مسلمانوں کی مخالفت میں ایک ہیں لیکن ہمارے مسلمان حکمران ان سے دوستی کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بوسنیا میں دراصل سربوں اور بوسنیائی مسلمانوں کی جنگ نہیں بلکہ یہ نئی صلیبی جنگ کا آغاز ہے۔ جو پوری دنیا اور پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے کر رہے گا۔ یہود نے مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے' وہ تین سال میں یہ کر گزرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں طرح طرح کی آزمائش میں مبتلا کر کے دیکھ لیا ہے کہ مسلمان نے ذلت کی زندگی گزارنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔ لیکن پھر اس اقدام سے یقیناً مسلم پرجوش جوانوں کا خون جوش مارے گا اور پھر خود ہمارے مسلم حکمران اپنے جوانوں کو دشمن اسلام کی خوشنودی کی خاطر روند ڈالیں گے۔ مشرق وسطیٰ پر پوری طرح سے امریکی سامراج مسلط ہو چکا ہے' اب وہ نیو ورلڈ آرڈر کی تعمیل میں سرگرم عمل ہے جو حقیقت میں جیو ورلڈ آرڈر ہے۔ امریکی سامراج پوری طرح سے یہود کی گرفت میں ہے۔ یہود مسلم امت کو اپنی گرفت میں لانے اور اس سے سخت سے سخت انتقام لینے کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس کے خلاف مضبوط اتحاد ایران پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کا ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد کے استحکام کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ ایران کو چاہئے کہ وہ پاکستان کے شیعوں کو یہ سمجھائے کہ وہ پاکستان میں اقلیت میں ہیں اس لئے ان کے حقوق پاکستان میں وہی ہوں گے جو حقوق ایران میں سنیوں کو دیئے گئے ہیں تو یہ اتحاد پائیدار پائندہ رہے گا۔ اسی سے ہم اپنے مشترکہ دشمن یہود و نصاریٰ سامراج سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے آخر میں فرمایا کہ ہمارے حکمران اور سیاست دانوں نے ہمیشہ اسلام کو ڈھال بنایا ہے اور اسلام کے نفاذ کے نعرے کے ساتھ حکمرانی کی ہے جبکہ انہوں نے اپنے اور اپنے گھر پر اسلام اور شریعت کو نافذ نہیں کیا اس لئے ان کا یہ طرز عمل منافقانہ اور مفسدانہ ہے۔

تنظیم فکر و نظر کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا کہ میں معزز مہمانان گرامی کی آمد پر اور خصوصی طور پر ڈاکٹر اسرار احمد کی تشریف آوری پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہماری دعوت

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

روزنامہ "جہاد" پشاور میں امیر تنظیم اسلامی کے دورۂ پشاور کی رپورٹ

ڈاکٹر صاحب اپنے خیالات و نظریات کا اظہار مصلحت کا لحاظ رکھے بغیر کرتے ہیں

موجودہ انتخابات ہمارے مسائل کا حل نہیں

مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے قوت اور طاقت کی ضرورت ہے

تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے گزشتہ ہفتہ پشاور کا دورہ کیا اس دورے کے دوران میں انہوں نے متعدد اجتماعات سے خطاب کیا انہوں نے ۱۷/ مئی کو اپنے خطابات کے بعد تشریف لے جانا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے قیام پشاور میں ایک روز کی توسیع کردی اور سرحد کے ممتاز قانون دان مسٹر وارث خان نے ۱۸/ مئی ۹۴ء کو ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ڈین ہوٹل میں عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں بلاشبہ صوبائی دارالحکومت کے دانشوروں' وکلاء ماہرین تعلیم' سابق وائس چانسلروں اور دوسرے حضرات نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں خواتین نے بھی شرکت کی موقع کی مناسبت سے تنظیم کے کارکنوں نے ڈاکٹر صاحب کی کتب کا بھی اہتمام کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار ہمارے ملک کے ان دینی رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کے دل میں اسلام کی عظمت رفتہ کی بحالی' قرآنی نظام کے احیاء اور عالم اسلام کی زبوں حالی کے خاتمہ کی سچی تڑپ پائی جاتی ہے بعض حضرات کو ان کے خیالات یا طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے خلوص اور گہرے جذبہ سے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ بات بلا خوف تردیدہ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اقبالیات پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور اپنی تقریر کو قرآنی آیات اور کلام اقبال سے مرصع کرتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تعلیمات اور اپروچ کے لئے یورپ اور امریکہ کا بھی دورہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ حال ہی میں انہوں نے قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں امریکہ میں بیس گھنٹے کا انگریزی میں پروگرام ریکارڈ کرایا ہے کیونکہ یورپ اور امریکہ میں اسلام اور عالم اسلام کے مسائل کو سمجھنے کے لئے انگریزی لٹریچر کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر ایک بار پھر اپنے حالات زندگی پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکن کی حیثیت میں ضلع حصار (انڈیا) میں شرکت کی۔ تحریک پاکستان میں حصہ لیتے ہوئے نعرے بھی لگائے جلسے جلوسوں میں بھی شرکت کی میٹرک کے طالب علم کی حیثیت میں انہوں نے اور ان کے ایک دوسرے ساتھی نے ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجتماع میں شرکت کی۔ یہ تاریخی اجتماع تھا جس سے قائداعظم نے خطاب فرمایا اور یہ اجتماع ذریعہ بنا حصول پاکستان کا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پاکستان کا حصول چونکہ پاکستان کا مطلب کیا "لا الہ الا اللہ" کے ذریعہ سے ممکن ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب جیسے مخلص اور گرم خون نوجوان کے لئے کسی ایسی جماعت کی تلاش تھی جو پاکستان میں عملاً اسلامی نظام کی نہ صرف داعی ہوتی بلکہ وہ اس کے لئے جدوجہد بھی کرتی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی میں شرکت کرلی۔ ان کا شمار جماعت اسلامی کے فعال ارکان میں ہونے لگا۔ لیکن بقول ڈاکٹر سات سال بعد جب حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمتہ نے انتخابی سیاسی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو وہ جماعت سے علیحدہ ہوگئے ڈاکٹر صاحب کے اپنے نظریات و خیالات ہیں ان کا اظہار وہ کسی مصلحت کے بغیر کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا پروگرام "الہدیٰ" جس کا ذکر مسٹر وارث خان ایڈووکیٹ نے اپنی تعارفی تقریر میں کیا کہ وہ بے حد مقبول تھا لیکن بعض "روشن خیال خواتین" یا "طبقات" کی "یلغار" کے باعث پاکستان ٹیلی ویژن کے ارباب بست وکشاد نے ڈاکٹر صاحب کا یہ پروگرام بند کردیا ڈاکٹر صاحب کی جدوجہد اپنے رنگ میں جاری ہے وہ پاکستان میں تحریک خلافت پاکستان کے ترجمان ہیں جو ایک الگ موضوع ہے ذیل میں ہم مسٹر وارث خان ایڈووکیٹ کی طرف سے منعقدہ عشائیہ کی مختصر رپورٹ درج کر رہے ہیں تاہم اس امر کا تذکرہ بے جا نہیں ہوگا کہ جس تعداد میں حاضرین نے ڈاکٹر صاحب سے تحریری طور پر سوالات کا جواب طلب کیا وہ ثابت کرتا ہے کہ اہل الرائے حضرات میں موجودہ ملکی اور عالمی حضرات سے گہرا شغف ہے درپردہ ان کٹھن حالات کا حل تلاش کرنے کے لئے بے قرار ہیں جو پاکستان میں ہر کسی کو مضطرب کئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ تقریر کو رپورٹ کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ در اصل ایک مضمون کی صورت ہی میں ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکتی ہے بہرحال چند نکات خبر کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں (مدیر)

"تنظیم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ پاکستان کے بقا کا واحد ذریعہ اسلام ہے کیونکہ اسلام ہی وہ واحد نظریاتی قوت ہے جو اسے متحد رکھ سکتی ہے ترکوں کے لئے ترک نیشنلزم اور عربوں کے لئے عرب نیشنلزم ہو سکتا ہے کیونکہ ترک ایک وحدت کی حیثیت میں موجود ہیں اور ان کی واحد ترکی زبان بھی ہے جو محدود نیشنلزم کا ذریعہ بنی۔ اسی طرح عربوں کے ہاں بھی عربی زبان ان کے لئے محدود عرب نیشنلزم کا ذریعہ بن سکتی ہے لیکن پاکستان کے لئے جہاں مختلف صوبے اور ان کی زبانیں رائج ہیں وحدت ملت کا واحد ذریعہ اسلام ہی ہو سکتا ہے لیکن اسلامی حکومت کے ساتھ ہمیں نظام کی تبدیلی کی بھی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صاحب صوبائی دارالحکومت کے ممتاز قانون دان مسٹر وارث خان کی طرف سے ڈاکٹر اسرار احمد کے اعزاز میں منعقدہ عشائیہ سے

خطاب کر رہے تھے۔ اس اجتماع میں ممتاز دانشوروں، وکلاء ڈاکٹروں اور صاحبان علم و فضل نے حصہ لیا مسٹر وارث خان نے ڈاکٹر اسرار احمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے رائج کرنے اور اسلامی تعلیمات کو رائج کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں ڈاکٹر اسرار احمد نے دور حاضر میں اسلامی نظام کے تقاضوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی اور اپنے خطاب کے بعد حاضرین کے سوالات کا جواب دیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے مسلمانان عالم کو بالعموم اور مسلمانان پاکستان کو بالخصوص پیش آمدہ مشکلات اور مسائل کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا اور قرآن کریم و احادیث کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا۔ آپ نے کہا کہ جب تک پاکستان سے فیوڈل ازم کا خاتمہ نہیں ہوگا اس وقت تک صحیح جمہوریت رائج نہیں ہو سکتی۔ آپ نے کہا کہ موجودہ انتخابات ہمارے ملکی مسائل کا حل نہیں کیونکہ یہ نظام انتخابات ناقص ہے اس نظام انتخاب کے نتیجہ میں جاگیردار، بڑے زمیندار یا سرمایہ دار ہی منتخب ہو سکیں گے۔ اس لئے پاکستان میں قرآنی نظام رائج کرنا ہوگا۔ ایک اور سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ ہمیں ہندوستان کے بارے میں بلا وجہ خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ ہندوستان نے اپنے آئینی اور نظریاتی مسائل کو حل کرلیا ہے اور اب وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ہندوستان نے نہ صرف آزادی کے فوراً بعد اپنا آئین نافذ کیا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کردیا۔ دوم تمام تر مشکلات کے باوجود ہندوستان نے بڑی جاگیرداریوں اور زمینداریوں کا خاتمہ کردیا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم دشمن کی طرف سے غافل نہ رہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے خبردار کیا کہ امریکہ کشمیر کی صورت میں ایک نیا اسرائیل قائم کرنا چاہتا ہے۔ مقبوضہ اور آزاد کشمیر کے ساتھ لداخ کا کچھ علاقہ ملا کر ایک نیا ربوہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان ایک کمزور اور تابع مہمل ملک بن کر رہے وہ پاکستان کو ایک قوت کی حیثیت میں دیکھنے کے حق میں نہیں۔ آپ نے کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قوم موجودہ رہنماؤں سے مایوس ہو چکی ہے، انہیں اب ان پر اعتماد نہیں رہا ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ برصغیر میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مختلف تحریکیں چلیں اور مختلف شخصیات نے اپنا کردار انجام دیا لیکن وہ اس مشن کو کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکیں۔ آپ نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ابتداء میں حزب اللہ کا تصور پیش کیا لیکن روایتی علماء نے ان کا راستہ روک دیا چنانچہ انہیں اپنا راستہ تبدیل کرنا پڑا اور وہ کانگریس میں ایسے گئے کہ اس میں گم ہو گئے اسی طرح مولانا مودودی مرحوم نے ابتدائی چھ سال اسلامی نظام کے لئے جدوجہد کی لیکن بعد ازاں وہ بھی دور حاضر کی سیاسیات اور انتخابات میں شامل ہو کر اصل مقصد فراموش کر گئے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی نظام نہ چل سکا حضور ﷺ کی وفات کے ۳۰ سال بعد تک یہ نظام چلتا رہا۔ اور تاریخ کے مختلف مواقع پر اسلامی نظام چلتا رہا۔ دنیا میں کسی بھی جگہ کوئی نظام ہمیشہ یکساں صورت میں رائج نہیں رہا۔ آپ نے کہا کہ مسلمانوں کو مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں اسلامی نظام کے قیام کے لئے تاریخ میں پیغمبروں کو بھی صدیوں تک جدوجہد کرنا پڑی۔ ہماری جدوجہد بھی جاری ہے خواہ وہ کتنی طویل ہی کیوں نہ ہو۔ آپ نے کشمیر کے حوالے سے رسول کریم ﷺ کی حیات سے متعلق متعدد مثالیں دیں اور کہا کہ ایک وہ وقت بھی تھا جب رسول کریم ﷺ کو معاہدہ پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کی قربانیاں دینا پڑیں لیکن جب تیاری مکمل کرلی تو انہیں تلوار اٹھانا پڑی۔ اس لئے کہ کفار نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ چنانچہ نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نکلا اس لئے ہمیں جنگ کی تیاری کرنی چاہئے۔

آپ نے بالواسطہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حصول کشمیر یا مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے قوت اور طاقت کی ضرورت ہے۔ کشمیری مجاہدین آخر کب تک بھارتی استبداری قوت کا مقابلہ کر سکیں گے۔ آپ نے عالمی طاقتوں کے دوہرے معیار کو بھی ہدف تنقید بنایا اور کہا کہ پاکستان کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے اندر اتحاد قائم کریں۔ OO

نظام میں اصلاحات کیا انتخابی سیاست سے بھی ممکن ہیں؟

محمد سمیع

تبدیلی تو انقلابی عمل سے گزر کر آئے گی

ہفت روزہ تکبیر کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس سوال کے جواب میں کہ "آپ بڑے تواتر سے نظام کی تبدیلی کا ذکر کر رہے ہیں، اس تبدیلی کا کوئی خاکہ آپ کے ذہن میں ہے؟" جواں سال سیاستداں، سابق وفاقی وزیر اور سابق وزیر اعظم جناب نواز شریف کے دست راست جناب چودھری نثار علی نے فرمایا۔ "میں چند بنیادی اصولوں کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں واضح طور پر یہ تعین کرنا ہوگا کہ اس ملک کا چیف ایگزیکٹیو کون ہے؟ ابھی تک عملاً یہ تعین نہیں ہو سکا۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی اقتدار کے دو ستونوں یا تین ستونوں کا فارمولا کامیاب نہیں ہوا۔ یہ فارمولا پاکستان میں بھی نہیں چل سکتا۔ ہمارے ملک میں چیف ایگزیکٹیو بے شمار زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔ بلکہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ طاقت کا حقیقی سرچشمہ کہاں ہے؟۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام ضروری تحفظات کے ساتھ قومی اسمبلی کی مدت کا تعین کردیا جائے۔ اور وزیر اعظم کو اس خوف سے آزاد کردیا جائے کہ کسی لمحے اس کی حکومت ختم ہو سکتی ہے۔ آئین میں اسمبلی کی مدت پانچ سال مقرر ہے۔ لیکن ۱۹۸۵ء سے اب تک ایک اسمبلی بھی یہ مدت پوری نہ کر سکی۔ یہ عدم تحفظ نظام کی پائیداری کے لئے مضر ہے"۔

"تیسری اور شائد سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک ہمہ وقت عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو کرپشن رشوت، اختیارات کے ناجائز استعمال اور بدعنوانی کے مقدمات کی سماعت کرے اور ایک مہینہ کے اندر اندر فیصلہ سناوے۔ صدر، وزیر اعظم، کابینہ چیف آف آرمی اسٹاف سب اس کمیشن کے دائرہ کار میں آنے چاہیں۔ کسی کو استثنیٰ حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ پاکستان کا ہر شہری اس کے سامنے جواب دہ ہو۔ اس کمیشن کو یہ اختیار بھی ہونا چاہئے کہ جھوٹا الزام لگانے والوں کو عبرت ناک سزائیں دے۔ احتساب کا یہ کڑا نظام وقت کا تقاضہ ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ نہ صرف عدلیہ اور انتظامیہ کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے بلکہ انتظامیہ اور مقننہ کے

درمیان بھی دیوار کھینچ دی جائے۔ ارکان اسمبلی کا بنیادی کام قانون سازی ہے' ان سے یہ توقع نہیں کی جانی چاہئے کہ وہ ایگزیکٹیو کا رول بھی ادا کریں۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو ارکان اسمبلی غلط طور پر حکومت پر اثرانداز ہوتے ہیں اور دوسری طرف اسمبلیوں میں اپنی ذمہ داری بھی احسن طریقہ سے ادا نہیں کرسکتے"۔

"میں نے اپنی آٹھ سالہ سیاسی زندگی میں دیکھا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر بہت محدود کرلیا ہے۔ نئی فکر اور نئی سوچ کے لئے اپنے دماغ کے دروازے بند کرلئے ہیں۔ انگریزوں کے عطا کردہ نظام کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ انگریزی بولنے والے کو تعلیم یافتہ اور جو انگریزی نہ بول سکے اسے ان پڑھ خیال کرتے ہیں۔ مغرب سے آئی ہوئی ہر شے کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے برطانیہ کے west minister system کو مقدس صحیفہ بنالیا ہے۔ حالانکہ یہ نظام برطانیہ کے سوا دنیا کے ہر ملک میں ناکام ہوچکا ہے۔ ہمارا مذہب الگ' ہمارا کلچر الگ' ہمارا مزاج' ہماری زبان' ہماری سوچ' ہمارا شعور' ہماری زمین' ہر چیز انگریزوں سے مختلف ہے۔ اس کے باوجود ہم ابھی تک کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ زخم پر زخم کھاکر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم کھلے دل سے اپنی سینتالیس (۴۷) سالہ تاریخ سے سبق حاصل کریں۔ ایک ایسے سیاسی نظام کی بنیاد اٹھائیں جس سے عوام مطمئن ہوں اور وہ جس کو قیادت کے منصب پر بٹھائیں وہ بطریق احسن اپنے فرائض سرانجام دے سکے"۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "میں سیاستدانوں کی وکالت نہیں کرنا چاہتا' یقیناً ہمارے اندر قابل گرفت لوگ موجود ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سیاستدانوں کو نااہل اور کرپٹ ظاہر کرنے کی ایک منظم مہم شروع ہوچکی ہے۔ مجھے اس مہم سے خطرناک عزائم کی بو آتی ہے۔ میں نے اسمبلی کے اندر بھی کہا تھا کہ سیاستدانوں کے خلاف کوئی قوت مکروہ کھیل کھیل رہی ہے۔ انہیں مذموم طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کیا کرپٹ لوگ فوج میں نہیں؟ کیا کرپٹ لوگ عدلیہ میں نہیں؟ کیا کرپٹ لوگ نوکرشاہی میں نہیں؟ کیا کرپٹ لوگ پولیس میں نہیں؟ کیا کرپٹ لوگ صحافت میں نہیں؟ کرپٹ لوگ معاشرے کے کس طبقے میں نہیں ہیں؟"

محترم چودھری نثار علی نے اس سے قبل اسی انٹرویو کے دوران فرمایا کہ اس وقت تک ہماری سویلین جمہوری قیادت کی ناکامی کا ایک سبب خود سیاستدانوں کا طرز عمل ہے لیکن اس کی زیادہ ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس نظام کو باقی رکھتے ہوئے حکومتوں کے ادل بدل سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میں واضح اور دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہوگا اس وقت تک اس ملک کی قسمت نہیں بدلے گی۔"

نظام کی تبدیلی کے اتنے واضح شعور کے باوجود چودھری صاحب موصوف نے نظام میں اصلاحات کی باتیں تو کی ہیں لیکن کوئی متبادل نظام سامنے رکھنے سے گریز کیا ہے۔ ان کا معاملہ بھی ان مذہبی سیاسی جماعتوں جیسا لگتا ہے جو جمہوری نظام کی تمام تر خرابیوں کا شعور رکھنے کے باوجود اور اس یقین کے باوجود کہ نظام کی تبدیلی کے بغیر کچھ حاصل نہیں' جمہوری نظام کے کھیل میں دوسری سیاسی جماعتوں سے مسابقت میں مصروف ہیں۔ اور اس عاشقی میں عزت سادات سے بھی ہاتھ دھو رہے ہیں۔ اس لئے کہ کسی گندے کھیل میں کوئی متقی شخص بھی شامل ہوجائے تو اس کے دامن پر بھی اس گندگی کے دھبے پڑنے لازم ہیں۔

ان کا یہ فرمانا بجا کہ "نظام کی تبدیلی کسی سازش کے ذریعے' کسی بغاوت کے ذریعہ' کسی مارشل لاء کے ذریعے یا کسی بھی غیر دستوری اقدام کے ذریعہ نہیں ہونی چاہئے۔ ایسا ہوا تو صرف ایک مخصوص ٹولے کو اقتدار تک پہنچنے کی سیڑھی مل جائے گی۔ ملک و قوم کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔" لیکن یہ کیسے تصور کرلیا جائے کہ ایک کرپٹ معاشرے میں جہاں سیاستدانوں سے لے کر صحافی حضرات تک کرپٹ ہوں' انتخابی سیاست کے ذریعہ بھی کوئی صالح انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی تبدیلی آئے گی تو وہ لازماً انقلابی عمل کے ذریعہ ہی آئے گی۔

بہرحال چودھری نثار علی صاحب کے خیالات ملک کے ان دانشوروں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں جو پارلیمانی جمہوری نظام کے مقابلے میں صدارتی نظام تک کی بات بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ وہ بھلا جمہوری نظام کو یکسر تبدیل کرنے کے لئے کس طرح آمادہ ہوسکتے ہیں؟۔ وہ تو اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے رہیں گے جس کے سبب بیمار ہوئے۔ خواہ

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بقیہ : رپورٹ سکھر

کو قبول فرمایا۔ موضوع کے لحاظ سے خلافت راشدہ کانفرنس وقت کی اہم ضرورت تھی اور ہے کیونکہ جو نظام ہمارے اکابر سلف نے قائم کیا ہے وہ آج کے لئے بھی نہایت موزوں ہے۔ خلفاء راشدین کے عظیم الشان دور سے اصل اسلامی طرز حکومت کا عملی نمونہ ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا عادلانہ نظام نافذ کرنا آسان اور سہل ہے کیونکہ صحابہ کرام و خلفاء راشدین نے عملی طور پر یہ نظام عدل نافذ کردکھایا۔ جب تک خلفاء راشدین کا نظام قائم رہا یہ دھرتی امن و انصاف کا گہوارہ تھی اور ناانصافی کی سب راہیں مسدود و محدود ہوگئیں۔ مہمان مقرر مفتی سندھ مولانا عبدالوہاب چاچڑ نے فرمایا کہ اسلام کا راستہ انقلاب ہے جو سراپا جہاد ہے باقی سب راستے غیر انقلابی ہیں۔ جمہوری نظام کو ہم نے بار بار آزمایا ہے جس میں نظام کی تبدیلی نہیں صرف چہروں کی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس نظام سے اب تبدیلی کی توقعات رکھنا عبث ہے۔ ہمیں سیرت خلفاء راشدین سے سبق حاصل کرنا چاہئے جس کا نصب العین انقلاب یعنی مکمل طور پر نظام کی تبدیلی تھا۔ صدر مجلس شیخ الحدیث مولانا محمد مراد حالیجوی نے فرمایا کہ خلفاء راشدین کا نافذ کردہ نظام حکومت درحقیقت آج کے دور کے لئے نہایت موزوں ہے کیونکہ اب یہ دنیا صرف اس نظام سے سنور سکتی ہے۔ خلفاء راشدین کا دور ہمارے لئے اور رہتی دنیا تک ایک بہترین مثال ہے۔ جس سے ہم جدید دور میں بھی ایک عدل و انصاف کی مثال قائم کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور مثالی حکومت موجودہ تاریخ نظیر پیش نہیں کرسکتی جہاں عدل و انصاف کا اتنا بہترین نظام قائم کرکے دکھایا گیا ہو۔ ہمیں چاہئے کہ خلفاء راشدین کی طرز حکومت سے اپنے نظام میں تبدیلی لائیں تاکہ عدل و انصاف ہر غریب و امیر کے لئے آسان و سستا ہوجائے۔ عادلانہ نظام کے حصول کے لئے اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے۔ جنرل سیکرٹری تنظیم پروفیسر اصغر مجاہد مہر نے اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ تنظیم کی تاریخ میں خلافت راشدہ کانفرنس کا انعقاد تنظیم اور خود ہمارے لئے بڑا اعزاز ہے کہ سنت نبوی و طریق و طرز عمل صحابہ کرام و خلفاء راشدین کو اپنانا ہی دراصل دین ہے۔ خلفاء راشدین کا عظیم الشان دور ہماری یا دنیا کی تاریخ کا درخشندہ تابندہ مثال لازوال منارۂ نور ہے' یہ مبارک دور عدل بھی ہے تو فضل بھی ہے۔ اب یہ دھرتی دنیا ظلم و ستم' جبر و استبداد اور ناانصافی سے بھر چکی ہے' اس کا واحد علاج قرآن و سنت اور خلفاء راشدین کے نظام خلافت میں مضمر ہے جو ہمارے سچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے و صالح ساتھیوں و صحابیوں نے علمی و عملی طور پر قائم کرکے دکھایا ہے۔ OO

دل 'صاحبِ اخبار' سے انصاف طلب ہے

لنکا سے باون گزوں کے ساتھ ایک نقاب پوش بونا بھی نکلا ہے

موقر روزنامہ نوائے وقت کی جانب سے امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان پر "عنایات" کا سلسلہ جاری ہے۔ ۲۷/ مئی کو ایک حد درجہ ناشائستہ تحریر ایک ایسے غیر معروف نام سے شائع ہوئی جس کی آڑ لینے والی شخصیت کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر ۲۹/ مئی کو سید سبط الحسن ضیغم کا انشائیہ نمودار ہوا جو بہت باخبر دانشور اور صحافی ہیں۔ انہوں نے تان اس بات پر توڑی کہ ڈاکٹر صاحب کو ادھر ادھر کی باتیں چھیڑنے کی بجائے قوم کی اصل بیماری کی طرف توجہ دینی چاہئے جو جاگیرداری وغیرہ ہے۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے' اسے کیا کہئے۔ ان دونوں مضامین کے جواب میں ایک مختصر تحریر میں نے ۳۰/ مئی کو نوائے وقت کے دفتر میں پہنچا دی تھی جو تا حال شائع نہیں ہوئی اور خیال یہ ہے کہ اول تو وہ نمودار ہو گی ہی نہیں اور کاٹ چھانٹ کے بعد آئی بھی تو شاید ادارتی صفحہ پر نہ ہو کیونکہ اس کے مندرجات لنکا سے نکلنے والے باون گزوں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے خلاف قلمی جہاد میں شریک اس بونے کی دل آزاری کا باعث ہوں گے جس نے پروفیسر رضوان الحق کے نام کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دفاع میں مرزا ایوب بیگ صاحب کی ایک تحریر ۴/ جون کے نوائے وقت میں جگہ پا لینے میں کامیاب ہو گئی ہے لیکن ادارتی صفحہ پر نہیں۔ واضح رہے کہ ادارتی صفحہ اس اخبار کے چار شہروں سے نکلنے والے سب ایڈیشنوں میں یکساں ہوتا ہے جبکہ دوسرے صفحات پر جگہ پانے والے مضامین بالعموم ہر ایڈیشن میں مقامی ضروریات کے مطابق بدل دیئے جاتے ہیں اور یاد ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف آج تک نوائے وقت میں شائع ہونے والا سو فی صد مواد ادارتی صفحات میں آیا ہے لیکن وضاحت میں لکھی جانے والی صرف ایک چیز کو اس صفحہ میں شمولیت کا اعزاز ملا' وہی جس کے جواب میں "پروفیسر رضوان الحق" کا "خوبصورت و خوب سیرت" جواب مضمون "تصریحات اقتدار بسلسلہ ڈاکٹر اسرار" کے عنوان سے نظر نواز ہوا ہے۔ گویا الزامی تحریریں تو نوائے وقت کے ہر قاری کی نظر سے گزریں لیکن جوابی تحریروں میں سے صرف ایک کو یہ شرف عطا کیا گیا ہے۔ دل "صاحب اخبار" سے انصاف طلب ہے۔ نوائے وقت کے ادارۂ تحریر کے سربراہ جناب مجید نظامی خود ہی اس طرز عمل پر نظر ثانی فرما کر فیصلہ کریں کہ عدل و قسط کے تقاضوں کی ایسی پامالی اقبال علیہ رحمت اور قائداعظم محمد علی جناح علیہ رحمت کے عقیدت مندوں اور حلقہ بگوشوں کو زیب بھی دیتی ہے؟۔

ہم اپنے قارئین کی خدمت میں مرزا ایوب بیگ صاحب کی تحریر اسی عنوان کے تحت اسی شکل میں پیش کر رہے ہیں جس میں اسے نوائے وقت نے شائع کیا اور میری وہ تحریر بھی دیکھ لیجئے جو تا حال اخبار میں جگہ نہیں پا سکی ہے۔۔۔۔ مدیر

کتاب و سنت پر مبنی ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات ۱

مرزا ایوب بیگ

ڈاکٹر اسرار احمد جن کی اصل پہچان تو مدرس اور مفسر قرآن کی ہے آج کل عالمی حالات کے پس منظر میں پاکستان کی بقا اور داخلی مسائل کے حل کے بارے میں اپنے نظریات بیان کرنے کے جرم میں اخباری دانشوروں کی گولہ باری کی زد میں ہیں۔ جس سے ڈاکٹر اسرار احمد سے قلبی تعلق رکھنے والے لوگ اور ان کی سیاسی بصیرت پر بے پناہ اعتماد کرنے والے حضرات صورتحال سے پریشان ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ نہ خلاف توقع ہے اور نہ پریشان کن۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی فہیم اور دوربین انسان نے اپنی بالغ نظری کی بنیاد پر اپنی قوم کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا تو وقت کے لال بھبھکڑ غول در غول اس پر حملہ آور ہوئے۔ بالخصوص جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہو اور مستقبل کے آئینے میں جو تصویر انہیں دکھائی جائے وہ ان کی بداعمالیوں کا عکس ہو تو ایسے حقائق ناقابل برداشت ہوا ہی کرتے ہیں۔ قوم بھی لوریاں دے کر سلانے والوں کو اپنا محسن سمجھتی ہے اور تلخ حقائق بیان کرنے والوں سے دامن بچاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ ڈاکٹر اسرار احمد کو دشمن کے ایجنٹ کی حیثیت سے مایوسی پھیلانے کا الزام دے رہے ہیں "آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے" انہی کا قول ہے اور قوم کا اخلاقی لحاظ سے انتہائی پستی میں گر جانے کا وہ سرعام اقرار بھی کرتے ہیں۔ اگر تاریخ سقوط بغداد' سقوط غرناطہ' سقوط ڈھاکہ سے خالی بھی ہوتی تو بھی یقیناً ان حالات میں ڈاکٹر اسرار احمد کی تنبیہات قابل غور تھیں۔ دانشوری یہ نہیں کہ طوفان یا اس کے آثار دیکھ کر بچاؤ کی صورتیں اختیار کی جائیں۔ حقیقی دانشور وہ ہے جو طوفان کو سمندر کی تہہ میں جا لے۔ ہمارے دانشوروں نے سقوط ڈھاکہ کے بعد طویل مرثیے لکھے اور پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد نوحے بھی کہے۔ سانحہ ڈھاکہ سے چند برس قبل ڈاکٹر اسرار احمد نے مشرقی پاکستان کے سیاسی بحران کے حل کے لئے جو تجاویز دی تھیں وہ ریکارڈ پر موجود ہیں لیکن اس وقت کرش انڈیا کا انتہائی جذباتی نعرہ اور شیخ مجیب الرحمٰن کو غدار اعظم قرار دے کر تختہ دار پر لٹکانے کا مطالبہ اتنا زور دار تھا کہ نقار خانے میں طوطی کی صدا کیسے اور کسے سنائی دیتی۔ مارشل لائی صدر یحییٰ خان کو مجاہد اسلام قرار دے کر جنگ میں دھکیلا گیا اور دلیل جو ظاہراً بڑی قوی دکھائی دیتی تھی کہ جب بشروع سے یہ طے کیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع بھارت پر مغربی پاکستان سے حملہ کر کے کیا جائے گا تو

اب وقت اسے پر ایسا یوں نہیں لیا جارہا۔

لہٰذا انہی عقل کے اندھے دانشوروں نے غلط وقت پر غلط حکمت عملی اور محض جذباتیت کی بنیاد پر ملک کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا جس کا نتیجہ انتہائی ذلت آمیز شکست اور ملک کے دولخت ہونے کی صورت میں نکلا۔ سقوط ڈھاکہ کو تو ہم قصہ پارینہ قرار دے چکے۔ مسئلہ سندھ ان بے چارے دانشوروں کو کیا سجھائی دیتا۔ اچھے بھلے لوگ اس وقت اس کا کوئی سراغ نہیں پارہے تھے۔ جب ڈاکٹر اسرار احمد نے قوم اور اس کے لیڈروں کو پرانے سندھی اور مہاجر کشمکش اور ان کے درمیان ہونے والے خوفناک تصادم کے خطرات سے پیشگی آگاہ کیا تو انہی دنوں ایک صاحب دانش کا بیان اخبار میں شائع ہوا تھا کہ سندھ ہم بھی جاتے ہیں ہمیں تو وہاں کسی کشمکش یا تصادم کے دور دور تک کوئی امکانات نظر نہیں آئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد خدا جانے کیوں مسئلہ سندھ کا شوشہ چھوڑ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ' اگر مجاز قوتوں نے بطور گائیڈ بک کے اپنے سامنے رکھ لی ہوتی اور سندھ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خلوص سے کوشش کرتے تو راقم یقین سے کہہ سکتا ہے کہ دشمنوں کی سازش کے باوجود آج سندھ کا مسئلہ انتہائی خوش اسلوبی سے حل ہو چکا ہوتا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کی بقا اور تحفظ کے لئے جو تجاویز دی ہیں ان میں سے ایک صوبوں کی مزید تقسیم بھی ہے جس پر یار لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ صوبوں کی تقسیم کو ملک کی تقسیم کے مترادف قرار دے کر ان پر بے ہودہ فقرے چست کئے جارہے ہیں۔ اگر صوبوں کی تقسیم سے ملک تقسیم ہو سکتے ہیں تو بھارت کو آج ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا چاہئے تھا۔ جس نے اپنے حصے میں آنے والے پنجاب کو جو ہمارے پنجاب سے چھوٹا تھا مزید تین صوبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی آزادی کے بعد بھارت نے اپنی سرزمین میں سے ایک انچ زمین بھی نہیں کھوئی جبکہ پاکستان جس نے انگریز آقا کے عطا کردہ صوبوں کی جغرافیائی تقسیم کو مقدس گردانتے ہوئے اس میں ذرہ برابر ردوبدل نہ کی' اپنا سب سے بڑا صوبہ بنگال اور امیر ترین ریاست حیدر آباد دکن فوجی شکست کی صورت گنوائے اور چین و ایران جیسے دوستوں کو تحفتاً اپنے علاقے پیش کئے۔ سندھ' سرحد' بلوچستان میں آج بھی صوبائی بے چینی اور عدم اطمینان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا صوبے تقسیم ہو کر ملک سے باہر نکل جائیں گے؟ پنجابی اور سندھی کی بنیاد پر صوبے تقسیم ہو سکتے ہیں تو سرائیکی سے کیا جرم سرزد ہوا ہے۔

کراچی اور حیدر آباد کی زمام اقتدار اگر مہاجرین کو سونپ دی جائے گی تو جو دعوے اور مطالبات وہ آئے دن کرتے رہتے ہیں' خود پورا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ ہاں اگر یہ تقسیم ہوئی تو سب صوبوں کی ہو گی کسی ایک صوبے کی تقسیم کر دینا بالخصوص اس وقت تو خودکشی کے مترادف ہو گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات پر بلاجواز اور بے سروپا کیچڑ تو بہت اچھالا گیا لیکن جو چیلنج ڈاکٹر صاحب کی طرف سے دیا گیا تھا اسے کسی نے قبول نہ کیا کہ اگر سندھ کے مسئلہ کا صوبے کی تقسیم کے علاوہ کوئی حل ہے تو سامنے لاؤ ورنہ کب تک فوج کو شہروں میں رکھا جا سکے گا اور اس سے پولیس والا کام لیا جا سکے گا اور پولیس کے حصہ کی بدنامی سے فوج کو کس طرح بچایا جائے گا۔ صدارتی نظام کے بارے میں عجیب و غریب گل فشانیاں تو سب قلم کاروں نے کیں لیکن جب نظریہ پاکستان کے علمبردار اور پاکستان میں جمہوریت کی حفاظت کے دعویٰ دار "نوائے وقت" کے ایڈیٹوریل میں راقم نے یہ پڑھا کہ صدارتی نظام کو تو ہم پہلے ہی آزما چکے ہیں صدر ایوب' یحییٰ خان' اور صدر ضیاء الحق کے ہاتھوں اس قوم کو بڑے چرکے لگے ہیں تو دفعتاً انا للہ وانا الیہ راجعون زبان پر آگیا۔ مارشل لا کے ڈنڈے سے زبردستی اپنے سروں پر صدارتی تاج رکھنے والوں کو جو اپنے منہ سے نکلے ہوئے لفظ کو قانون کا نام دیتے تھے اور ملکی آئین کو سولہ صفحے کی بے کار دستاویز کہتے تھے جسے جب چاہیں پھاڑ کر پھینک دیں ایسے لوگوں کی من مانی کارروائیوں اور اس سے ہونے والے نقصانات کو صدارتی نظام کے کھاتے میں ڈال کر اس کی ناکامی کا اعلان کسی جمہوریت پسند کو کس طرح زیب دیتا ہے۔ پھر یہ کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے کبھی یہ نہیں کہا کہ صدارتی نظام کی حمایت وہ دینی نقطہ نظر سے کرتے ہیں یا یہ کوئی شریعت کا حکم ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ ہمارے مخصوص حالات میں صدارتی نظام حکومت پارلیمانی نظام سے بہتر ہے۔ پارلیمانی نظام نے جتنی برائیاں اس ملک میں پھیلائی ہیں اس سے زیادہ برائیاں تو شاید کوئی ننگا فاشی نظام اور خالصتاً انارکی سے بھی نہیں پھیل سکتیں۔ ہمارے لیڈروں کی تمام توانائیاں اور ملکی وسائل اسمبلی کے ان مینڈکوں کو سنبھالنے میں لگ جاتی ہیں جو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھدکتے رہتے ہیں۔

وزیر اعظم چیف ایگزیکٹو ہے تمام ذمہ داریاں اس کی ہیں۔ اسمبلی اور عوام کو وہ جواب دہ ہے لیکن آئینی صدر پر نہ کوئی ذمہ داری ہے اور نہ وہ کسی کو جواب دہ ہے لیکن وزیر اعظم کی چھٹی کرا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاک بھارت تعلقات ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ان کے درمیان دوستی تو یقیناً دور کی بات ہے' دشمنی کا ختم ہونا آسان بات نہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صرف پاکستانی عوام اور لیڈروں کو یہ مشورہ نہیں دیتے کہ ہندوستان سے معمول کے تعلقات بحال کرنے کے راستے سوچیں اور اس سے اپنے تنازعات کو ختم کر دیں بلکہ دونوں ملکوں کے عوام اور لیڈروں سے سوال کرتے ہیں کہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تو سہی ایک دوسرے کی دشمنی نے تمہیں کیا دیا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ تم لڑتے رہو اور اس کے اسلحہ سازی کے کارخانے چاندی بلکہ سونا پیدا کرتے رہیں' کون چاہتا ہے کہ تم اپنے تمام وسائل کو جنگ کا ایندھن بناتے رہو اور دونوں اس کے مقروض اور محتاج رہو۔ حاکم بھی اس کے در کا طواف کرتے رہیں اور عوام بھی رزق کی فراخی کے لئے ان کے ہاں در در کی خاک چھانتے رہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کب کہا ہے کہ ہر حالت میں ہر شرط پر بھارت سے صلح کر لی جائے۔ ظاہر ہے بہتر تعلقات مذاکرات اور آبرومندانہ انداز سے ہی کئے جاسکتے ہیں۔ البتہ یہ کہ بعض معاملات میں مصلحت کے تحت دبنا بھی پڑتا ہے اور اس کے لئے وہ صلح حدیبیہ کی مثال بھی دیتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمیں امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بننا قبول' آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے وفادار بھی ہو سکتے ہیں' ہم یو این او کے لیبل سے امریکہ کے حکم پر دنیا کے ہر حصے میں حتیٰ کہ مسلمان ممالک کے خلاف بھی افواج بھیج سکتے ہیں۔ امریکہ کو ہر سطح پر اپنے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت دے سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ سطح کی تعیناتی میں امریکہ کی ایڈوائس چلتی ہے۔ یعنی امریکہ کی غلامی کے پھندے کو باقاعدہ پوری طرح پیائش کر کے اپنے گلے میں ڈال چکے ہیں اور ڈالے رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ ہمیں یہود و نصاریٰ کے بارے میں واضح طور پر کہہ چکا ہے کہ وہ آپس میں دوست ہیں تمہارے دوست کبھی نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن بھارت کے ساتھ

کچھ لوگ اور کچھ دو کے فارمولے کے تحت بھی معاملات کو ختم کرنے کو ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات بالخصوص بھارت کے ساتھ تعلقات کے معاملے میں ہر شخص کو اختلاف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن غیر منطقی و بلا دلیل الزام تراشی اور بلا ثبوت ان کی ذات پر رکیک حملے کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ ○○

زبردست کا ٹھینگا سر پر

اقتدار احمد

سچ پوچھئے تو نوائے وقت کے ادارتی صفحہ (۲۷/ مئی) پر "تصریحات اقتدار بسلسلہ ڈاکٹر اسرار" پڑھ کر دکھ ہوا کہ اس موقر قومی روزنامے کی بیش قیمت "کالم سپیس" کا یہ بھونڈا استعمال تو فاضل مضمون نگار "پروفیسر رضوان الحق" کی طرف سے درحقیقت ایک نوع کا استحصال ہے چنانچہ کوشش ہو گی کہ میں خود کو اس جرم میں ملوث نہ ہونے دوں' قارئین کی خدمت میں اپنی معروضات بہت اختصار کے ساتھ پیش کروں اور اس بات کا فیصلہ پڑھنے والوں پر ہی چھوڑ دوں کہ میری پچھلی تحریر بقول پروفیسر صاحب "تند و تیز" تھی یا یہ جواب مضمون جسے پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن پر غالب کا ایک شعر طاری رہا ہو گا جس کا مصرعہ اولیٰ یہ ہے کہ "تلخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر"۔ البتہ اس وضاحت کے لئے چند جملوں کا اضافہ ضرور کرنا پڑے گا کہ فاضل مضمون نگار کا نام میں نے واوین میں کیوں لکھا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے قومی مزاج میں شخصیات کے ساتھ پسندیدگی و ناپسندیدگی کے رویوں میں ایک بڑا ہی غیر صحت مندانہ رجحان یہ رچ بس گیا ہے کہ کچھ لوگوں کو تو ہم شیاطین قرار دے لیتے ہیں جن میں کسی درجے کے خیر کی موجودگی کا ادنیٰ سا امکان بھی تسلیم نہیں کرتے اور جنہیں فرشتے سمجھنے لگیں ان کی زندگیوں کے ہر پہلو کو ہر طرح کی خامی' کوتاہی یا کجی سے پاک جاننا دین و ایمان کا حصہ بن جاتا ہے۔ ہمارے کسی بھی قومی ہیرو کا دین و مذہب کے معاملے میں کلی یا جزوی طور پر افراط و تفریط کا شکار ہو جانا ناقابل تصور ہے اور اپنے پسندیدہ مذہبی رہنما سے عصری تقاضوں کو سمجھنے میں صادر ہونے والی بڑی سے بڑی غلطی تک کو بھی چوم چاٹ کر پیشانی سے لگا لینا ہمارا شیوہ بن گیا ہے اور یہ اس حال میں ہے جب ہمارے نزدیک معصومیت انبیاء و رسل پر ختم ہو چکی ہے اور اہل تشیع سے ہمارے بنیادی اختلافات میں سے ایک یہی معصومیت امام کا مسئلہ ہے۔ اب جو تحریر موضوع گفتگو ہے اس کے مندرجات کو یاد کیجئے تو صاف پتا چلے گا کہ تنقید کے نام پر پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد کی گوشمالی کرنے اور ان کے خلاف اپنے بغض و عناد کی تسکین میں سب سے زیادہ مدد خواص و عوام کے بعض اہم شخصیات سے وابستہ جذبات کو اشتعال دے کر حاصل کی ہے۔

کیا قیامت ہے کہ قائداعظم علیہ رحمہ سے تنفر و عداوت کا الزام اس شخص پر دھرا جا رہا ہے جس نے اپنی تحریروں میں دہرا دہرا کر لکھا اور منبر رسول پر کھڑے ہو کر بھی یہ تک کہا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانان برصغیر کے حق میں کار رسالت انجام دیا کہ حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) کے فرائض رسالت میں بھی پہلا کام بنی اسرائیل کو قوم فرعون کے پنجہ استبداد سے رہائی دلوانا ہی تھا اور جو انہیں معمار پاکستان قرار دیتے ہوئے ان کی دیانت و امانت کی قسم کھاتا ہے۔ علامہ اقبال علیہ رحمہ کو مصور پاکستان کے نام سے پکارنے والے ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں پروفیسر صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ شخص ان کی بصیرت کو مشکوک بنا رہا ہے جبکہ ان کا کلام اس کے نزدیک قرآن کی ایک حسین و جمیل تفسیر ہے اور علامہ کا شمار وہ علیٰ رؤس الاشہاد اس صدی کے مجددین امت میں کرتا ہے۔ دوسری طرف کیا اس شخص پر مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا مودودی کا نام لے کر طعن توڑنا قرین انصاف ہے جس نے ان سب زعماء کے ساتھ عقیدت کے اظہار کے باوجود ان کے اسلامیان ہند کے سیاسی عزائم کا ساتھ نہ دینے کی حکمت عملی سے کھلم کھلا اعلان براءت کیا ہے۔ ہمیشہ کہا کہ میری فکری مناسبت الہلال و البلاغ والے مولانا ابوالکلام سے ہے' بعد والے مولانا آزاد سے ہرگز کوئی تعلق نہیں' مولانا مدنی جیسے سکہ بند علماء کے تدین کا احترام کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ ان بے چاروں کو ہندو کی عیاری و مکاری کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ مسجد و مدرسہ و خانقاہ میں قال اللہ و قال الرسول میں زندگیاں بسر کر دینے والوں کو کیا خبر تھی کہ اپنے ان اداروں کو لشتم پشتم چلانے سے بڑا بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں کیا صرف ساتھ رہنے میں بھی درپیش ہے اور خود کو علی الاعلان مولانا مودودی کے بنیادی فکر کا خوشہ چیں مانتے ہوئے بھی ڈاکٹر اسرار احمد نے تحریک پاکستان سے ان کی لاتعلقی کو ایک بڑی غلطی قرار دے کر اس پر ہمیشہ قلق کا اظہار کیا۔ ان سب باتوں میں سے کسی ایک کو بھی میری طرف سے انکشاف نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ تمام باتیں بڑی ہی شرح و بسط کے ساتھ ان کی متعدد کتابوں اور لاتعداد آڈیو ویڈیو کیسٹوں میں محفوظ ہیں۔ بلکہ دور کیوں جایئے 'نوائے وقت ہی کی سال گزشتہ کی فائل اٹھا کر دیکھ لیجئے جس میں ڈاکٹر اسرار احمد کے درجنوں سلسلہ وار مضامین خاص ان موضوعات پر مل جائیں گے جو متذکرہ بالا شخصیات کے کردار پر سیر حاصل مباحث کے بغیر مکمل ہی نہ ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نام بنام ان حضرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھنے والے کو ان کے بارے میں اپنی آراء بھی ظاہر کرنی پڑی ہیں اور وہ اس سے بالکل مختلف پائی جائیں گی جو پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے منسوب کیں بلکہ ان کے سر تھوپی ہیں۔

ملک و قوم کے مستقبل کی فکر رکھنے والے ہر اس شہری کو اپنے خدشات ہموطنوں کے سامنے رکھنے کا حق ہے جو سوچنے سمجھنے کی اہلیت اور ما فی الضمیر کو بیان کرنے کی صلاحیت کے علاوہ اپنا کوئی پلیٹ فارم بھی رکھتا ہے۔ اسی حق کو ڈاکٹر صاحب نے استعمال کیا اور آج پہلی بار نہیں کیا بلکہ عرصے سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی کوئی بات یہ کہہ کر کسی بھی تحریر و تقریر میں پیش نہیں کی کہ مجھے یہ الہام ہوا ہے۔ تجزیہ کیا' دلیل دی' نظائر سامنے لائے اور ضروری حوالے بھی مہیا کئے اور سب سے زیادہ زور اس رہنمائی پر دیا جو مسئلہ زیر بحث میں ان کے خیال کے مطابق قرآن و حدیث کے سرچشمہ ہدایت سے حاصل ہوتی ہے۔ اب کسی کو ان سے اختلاف ہے تو اختلاف کے اظہار کا حق بھی سر آنکھوں پر۔ اختلاف کرنے والے صاحب اپنا وہ تجزیہ پیش کریں جو ڈاکٹر صاحب کے تجزیے سے مختلف ہو' دلیل کا جواب دلیل سے دیں' نظائر اور حوالے غلط یا غیر متعلق ہیں تو ان کی تصحیح کریں اور قرآن و حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں تو تعبیر کی غلطی کی نشاندہی کریں یا بتائیں کہ متعلقہ ہدایت قرآن و حدیث کے ان مقامات سے نہیں ملتی جو ڈاکٹر

صاحب نے منتخب کئے بلکہ یہاں سے اخذ کی جانی چاہئے جن کا حوالہ وہ خود دے رہے ہیں۔ تنقید و تبصرے کا یہ مثبت انداز اختیار کیا جائے تو اس میں سب کا بھلا ہے' ملک و قوم کا بھی اور خود ڈاکٹر صاحب کا بھی کہ اپنے خیال سے رجوع کرلیں گے ورنہ کم از کم ان پر اتمام حجت تو ہو ہی جائے گا۔

پروفیسر صاحب کے جواب مضمون میں یہ اسلوب اپنایا گیا ہوتا تو ہم ان کے ممنون احسان ہوتے لیکن افسوس کہ اصلاح احوال انہیں مطلوب ہی نہیں۔ شروع سے آخر تک ان کے قلم نے زہر اگلا اور ان کے دل کی بھڑاس نکال کر کاغذ پر پھیلا دی۔ قرآن مجید سے استنباط کا انداز یہ ہے کہ "ہمیں تو بس اتنا علم ہے" کہہ کر ایک ایسی محکم آیت کو اپنے من پسند مفہوم میں لپیٹ کر رکھ دیا جو قرآن حکیم میں ایک جگہ نہیں الگ الگ سیاق و سباق میں تین مقامات پر وارد ہوئی ہے جبکہ ان کی پسند کا مفہوم بھی وہ ہے جو شاذ ہی کسی مفسر قرآن کے ہاں ملتا ہو ورنہ درجنوں ان حقدمین و متاخرین نے جن کی پوری پوری زندگیاں اس کتاب ہدایت کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں کھپ گئیں' بالکل مخالف وہ مطلب سمجھا جسے ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے موقف کی بنیاد بنایا ہے۔ اسی طرح ظہور دجال اور آثار قیامت وغیرہ کے باب میں متفق علیہ احادیث کے پورے ذخیرے کو "اسرائیلی روایات' من گھڑت کہانیاں' گروہی داستانیں اور عجمی نظریات" قرار دینے والے اپنے ناقد کو ڈاکٹر اسرار احمد سمجھائیں تو آخر کیا سمجھائیں۔

چلئے' ہم مانے لیتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا صغریٰ کبریٰ غلط ہے اور لرزہ خیز نتائج بھی ظاہر ہے کہ باطل ہو گئے جن سے وہ اہل وطن کو خبردار کر رہے ہیں لیکن اب پروفیسر صاحب ہی تشخیص فرمائیں کہ ملک و قوم کو کچھ عوارض لاحق بھی ہیں یا یہ محض ڈاکٹر اسرار احمد کا واہمہ ہے اور اگر واقعی یہاں کوئی فساد پایا جاتا ہے تو اس کو فرو کرنے کی تدابیر کیا ہونی چاہئیں۔ پاکستان کو حضرت قائداعظم اور علامہ اقبال علیہما الرحمہ کے نظریات کے سانچے میں ڈھالنا اگر ضروری ہے تو کیسے؟۔ کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں۔ پھر آپ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے حوالے کو بے معنی سمجھتے ہیں کیونکہ "سب سے بڑی عدالت" کا فیصلہ ہی آپ کے لئے کافی ہے تو سود کا متبادل نظام تجویز کرنے کی ذمہ داری ان علمائے کرام پر کیوں جن کی اکثریت کو آپ نے پہلے ہی اپنے قلم کے "مولا بخش" سے دھن کے رکھ دیا ہے؟۔ دانا و بینا اور بحر علوم کے شناور تو آپ ہیں' روح اسلام کے محرم راز بھی آپ اور مسلمانی تو ظاہر ہے کہ آپ ہی کی جمعرات کی روٹیوں پر پلنے والے دین کے ان "نام نہاد" ٹھیکیداروں سے زیادہ پکی ہے تو پھر "سب سے بڑی عدالت" کے فیصلے پر عملدرآمد کا انتظام و انصرام آپ خود کیوں نہیں کرتے؟۔ یہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ' کڑوا کڑوا تھو" کا طرز عمل مولویوں ملاؤں کو تو زیب دیتا ہے' آپ پر نہیں پھبتا۔ اور ایک ضمنی بات یہ کہ آپ کا فرمان کہ "وہ عصبیت جاہلیہ کے سب سے بڑے علمبردار جو ظالم و جابر بھی تھے' مکار اور مفسد بھی' بددیانت اور جھوٹے بھی' جب نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تو وہی منفی صفات مثبت بنتی چلی گئیں" اتنا صحیح نہیں' جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ اگر حضورؐ سے منسوب یہ اقوال مبارکہ "عجمی روایات" نہیں ہیں جدید علم النفس بھی جن کی تائید کرتا ہے اور جن میں ایک کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی کیسے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے تو مان لو لیکن یہ نہ مانو کہ کسی شخص کی سرشت بھی تبدیل ہو سکتی ہے اور دوسرا جامع اور مختصر ہے اس لئے متن ہی لکھ رہا ہوں کہ "خیار کم فی الجاہلیہ' خیار کم فی الاسلام" یعنی بنیادی انسانی خوبیاں جن لوگوں میں اسلام لانے سے پہلے زیادہ تھیں انہی میں اسلام لانے کے بعد بھی زیادہ رہیں' تو خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ "برہمن زادے" کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی بات حقیقت سے قریب تر ہے یا آپ کی۔

زبردست کا ٹھینگا سر پر' پروفیسر صاحب نے پہلے تو یہ کرم فرمایا کہ آپ جناب کرتے ہوئے یہ لکھ کر کہ "جناب اقتدار احمد صاحب کو اس بات پر بہت اصرار ہے کہ وہ خود اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب درویشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں" مجھ ناچیز کو ڈاکٹر صاحب کی اس درویشی میں "بریکٹ" کر دیا جس کا دعویٰ میں نے نہ اپنی زیر بحث تحریر میں کیا تھا نہ آگے پیچھے کبھی کسی نجی گفتگو تک میں کیا اور پھر خود ہی "بیٹی سے کہوں' بہو کو سناؤں" کے انداز میں مجھے وہ ملاحیاں سنائی ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ بھائی' میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر صاحب کے متعلقین میں شامل کیا تھا اور ان کے بارے میں جو لکھا وہ الحمد اللہ کہ مجھ پر بھی صادق آتا ہے۔ بایں ہمہ میں نے پارسائی کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا اور تنظیم اسلامی میں شرکت کی شرط یہ ہے بھی نہیں کہ آدمی گنگا نہا کے آیا ہو' صرف اس ارادے کا قولی اور عملی اظہار ضروری ہے کہ آئندہ کبائر سے اجتناب کیا جائے گا اور فرائض دینی کی ادائیگی کو دنیاوی مشاغل پر ترجیح دی جائے گی۔ سو اس کی کوشش بساط بھر کر رہا ہوں اور اس جانب اگر کوئی پیش رفت ہو سکی ہے تو وہ ہرگز میرا کوئی کارنامہ نہیں' محض توفیق الٰہی سے ممکن ہوئی ہے۔ بہرصورت اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ "کلھم آتیہ یوم القیامہ فردا" یعنی حشر میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں جوابدہ ہوگا' تو وہاں اپنا معاملہ میں خود نمٹاؤں گا' آپ میری فکر میں دبلے ہوتے رہیں تب بھی آپ کے اس ایثار سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ ہی سے دعا کرتا ہوں کہ اللھم حاسبنی حسابا یسرا۔ تاہم صاف نظر آتا ہے کہ میرا حدود اربعہ تو انہیں معلوم ہے اور گھر کا کوئی بھی بھیدی لنکا ڈھا ہی لیا کرتا ہے' انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تو کون سا تیر مارا لیکن میں ان کا تاریخ جغرافیہ جاننے کے باوجود اس کا کوئی حوالہ نہیں دے سکتا تو اس لئے کہ انہوں نے رخ روشن پر "پروفیسر رضوان الحق" نام کا نقاب ڈال رکھا ہے۔ میں مضمون نگار کو پہچان تو گیا ہوں کہ "من انداز قدت رامی شناسم" لیکن ظن کے بنیاد پر کچھ کہہ سن نہیں سکتا چاہے وہ حق الیقین تک پہنچا ہوا ہو۔ انہوں نے چلمن کی اوٹ نہ لی ہوتی تبھی کھل سکتا تھا کہ وہ خود کس پیر کے پوتے ہیں۔ البتہ ان سے یہ ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ عزیز من! آپ کی تحریر میں کاٹ بلا کی بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ ہے۔ اللھم زد فزد بلکہ آپ ہی کے اسلوب میں کہوں تو "ضد بضد"۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ' لیکن اس پر واجب شکر کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ خداداد صلاحیت کسی تعمیری کام میں ہی استعمال ہو۔

آخر میں محض چند جملے ۲۹/ مئی کو ادارتی صفحہ پر نمودار ہونے والی سید سبط الحسن ضیغم کی تحریر کے بارے میں۔ انہوں نے "ڈاکٹر اسرار احمد ..... اور اصل خطرات" کے زیر عنوان لکھتے ہوئے جو طویل تمہید باندھی ہے' اس پر تبصرے کو بشرط زندگی اٹھوا میں ڈالتے ہوئے ملک کے اس انتہائی باخبر اور دانشور صحافی کی خدمت میں ایک شعر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اور اس کی شرح یہ ہے کہ انہوں نے اختتامی پیرے میں گویا ٹیپ کا بند جو یوں ارشاد فرمایا ہے کہ "اس لئے

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

ہفت روزہ "فیملی" میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو

اب ملکی سیاست میں مذہبی طبقے کا کوئی کردار نہیں رہا

مجھے حکومت سے نہیں 'نظام سے دلچسپی ہے

جوہری پروگرام اور کشمیر سے میری دلچسپی کوئی راز نہیں

ہفت روزہ "فیملی" کی اشاعت ۱۷ تا ۲۳ مئی ۹۴ء میں ڈاکٹر اسرار احمد سے معاصر کے نمائندے 'شبیر الحسن عثمانی کے اس انٹرویو کو شکریئے کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے جو کراچی میں لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا کہنا ہے کہ انٹرویو میں ان کے خیالات کی ترجمانی تو درست ہے لیکن "برگر" اور "برگر فیملی" غالباً ان کے الفاظ نہیں کیونکہ وہ آج بھی ان کے اس استعمال سے ناآشنا ہیں۔ ان کے استعمال کردہ مترادف الفاظ کچھ اور رہوں گے۔ یاد رہے کہ انٹرویو پر سرخی ہی یہ جمائی گئی ہے کہ "اسمبلی میں پہنچ کر ملا "برگر" بن جاتے ہیں"..... مدیر

○... سوال: "ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ صورتحال کب تک جاری رہے گی؟ افواہیں گردش کر رہی ہیں کہ حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں؟"

☆... جواب: "میں تو کوئی سیاسی نجومی نہیں ہوں۔ مجھے حکومت سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میری اصل دلچسپی نظام سے ہے۔ نظام اگر یہی رہتا ہے تو "خر آمد کہ گاؤ رفت یا گاؤ آمد کہ خر رفت" یعنی گدھا آئے اور گائے چلی جائے یا گائے آئے اور گدھا چلا جائے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ تمام سیاستدان ایک ہی قسم کے ہیں۔ ان کا کردار اور معاملات ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ اکثر و بیشتر ادھر سے ادھر جا کر وہ اپنے "لیبل" اور "مارکے" بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی اکثریت کے لئے سیاست میوزیکل چیئر کا کھیل ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ذاتی مفادات کی سیاست سے مستثنیٰ ہوں گے۔ البتہ میں ایک بات کو مثبت قرار دیتا ہوں وہ یہ کہ ہمارا نظام حکومت جو مغربی جمہوریت کی نقالی ہے' دو جماعتی سسٹم کی طرف چل پڑا ہے۔ اگر دو جماعتی نظام رواج پکڑے گا تو یہ لولی لنگڑی جمہوریت باقی رہ جائے گی ورنہ اصلاح کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس کے نتیجے میں یہ ایک مثبت تبدیلی سامنے آئی ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس نظام سیاست نے وہ شکل اختیار نہیں کی ہے کہ اپوزیشن بھی مثبت انداز اختیار کرے۔ یہ بات میں صرف موجودہ قائد حزب اختلاف نواز شریف کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ جن دنوں بے نظیر صاحبہ اپوزیشن لیڈر تھیں' تو انہوں نے حکومت گرانے کے لئے جو ہتھکنڈے اختیار کئے تھے' ان میں اور موجودہ حالات میں کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر دو جماعتی نظام فروغ پاتا ہے تو اس سے ملکی سیاست میں بہتری کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔"

○... سوال: "لیکن اس سے مذہبی حلقہ پس منظر میں چلا گیا ہے؟"

☆... جواب: "جی ہاں' حالیہ انتخابات کے نتیجے میں مذہبی حلقہ یقیناً پس منظر میں چلا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ مذہبی حلقہ کچھ عرصے کے لئے پس منظر میں چلا گیا تھا۔ میں یہ ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت کی بات کر رہا ہوں' اگرچہ اب وہ دور پس منظر میں جا رہا ہے۔ ان کی وجہ سے بھی مذہبی حلقہ کافی متاثر ہوا تھا۔ ویسے ہمارے ہاں کی سیاست پر ۸۰ فیصد قبضہ جاگیرداروں' سرداروں اور وڈیروں کا ہے۔ جبکہ باقی ماندہ بیس فیصد سیاست پر نو دولتئے سرمایہ داروں اور شہروں میں رہنے والے چند مذہبی حلقوں کا اثر تھا۔ مذہبی حلقوں کا سیاست میں شہروں کی حد تک جو رول تھا' وہ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے یا اگر یہ کہہ لیں کہ مذہبی طبقہ شہری سیاست سے واش آؤٹ ہو چکا ہے تو درست ہو گا۔ کراچی میں مذہبی طبقے کی سیاست کا صفایا مہاجر قومی موومنٹ نے کیا تھا۔ اب صرف ملک کے پشتو بولنے والے سرحدی علاقوں میں مذہبی طبقہ کا کچھ اثر باقی رہ گیا ہے ورنہ ہر جگہ انہیں منہ کی کھانا پڑی ہے۔ حقیقت میں اس وقت ہماری ملکی سیاست میں مذہبی طبقے کا سرے سے کوئی رول نہیں ہے۔ مذہبی طبقے کا ملکی سیاست میں بچا کھچا یہ اثر صرف اس وقت تک ہے جب تک یہاں دو جماعتی نظام مستحکم نہیں ہو جاتا۔ دو جماعتی نظام جتنا مستحکم ہو گا مذہبی طبقے کا اتنا ہی زیادہ صفایا ہو جائے گا۔ ان کی بارگیننگ پاور جو کم ہو رہی ہے بالکل ختم ہو کر رہ جائے گی۔"

○... سوال: "اس کے نتائج تو بہت زیادہ خطرناک ہوں گے؟"

☆... جواب: جو کچھ بھی ہو یہ اصل میں مذہبی طبقے کی اپنی غلطیوں کا خمیازہ ہو گا' جو انہیں بھگتنا پڑے گا۔ مذہبی طبقے کو سیاست میں ایک "مزاحمتی تحریک" کا رول ادا کرنا چاہئے تھا اور انہیں پاور پالیٹکس کا شریک نہیں بننا چاہئے تھا۔ مذہبی طبقے نے یہ غلطی کی اور اب انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ جب تک انہیں اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا اس وقت تک یہ زوال پذیر رہیں گے۔ میرے خیال میں مذہبی طبقے کے لئے یہ چند ضروری کام ہیں جو انہیں کرنا چاہئیں۔

(۱) عوام کے اندر دین کا شعور پیدا کرنا' ان کے اخلاق اور کردار میں ایمان اور اس کے تقاضوں کو پیدا کرنا۔

(۲) نیکی کا حکم دینا چاہئے اور بدی سے روکنا چاہئے۔ بدی سے روکنے کے لئے حضور ﷺ نے جو تین درجے بتائے ہیں ان کے مطابق کام کرنا ہو گا۔

میرے خیال میں انہیں اتنی بڑی طاقت بن جانا چاہئے کہ وہ چیلنج کر سکیں کہ اس برائی کو آئندہ نہیں

ہونے دیں گے۔ یعنی مذہبی طبقے کو ان دونوں سطحوں پر کام کرنا چاہئے۔"

○... سوال : "ڈاکٹر صاحب! آپ کے خیال میں دو جماعتی نظام سیاست کے نتیجے میں مذہبی طبقے کا صفایا ہوجائے گا تو پھر یہ کس طرح طاقت بن سکیں گے؟"

☆... جواب : "مذہبی طبقے کو عوامی سطح پر طاقت بننا چاہئے۔ سیاسی سطح پر طاقت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ عوامی سطح پر یہ لوگ طاقت حاصل کریں گے تو پھر کوئی تبدیلی آسکے گی۔ جیسے ایران میں مذہبی طبقے نے عوامی پزیرائی کے نتیجے میں انقلاب برپا کردیا۔"

○... سوال : "عوام کی اکثریت کا خیال ہے کہ مذہبی عناصر نے انہیں تقسیم در تقسیم کردیا ہے؟"

☆... جواب : "دیکھیں جی' اگر مذہبی عناصر انتخابی سیاست چھوڑ دیں گے تو یہ الزام خود بخود ختم ہوجائے گا۔ عوام کا الزام یہ ہے کہ مذہبی عناصر ووٹ تقسیم کرادیتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے تو عوام کا الزام ختم ہوجائے گا۔ جس سے عوام کے اندر ان کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوسکتا ہے۔"

○... سوال : مذہبی طبقہ انتخابی سیاست چھوڑ دے گا تو اسمبلیوں پر ایک مخصوص طبقے کا قبضہ ہوجائے گا؟"

☆... جواب : اسمبلیوں میں سب لوگ چاہے آجائیں لیکن عوامی سطح پر اگر ایک مزاحمتی تحریک کھڑی ہوجائے کہ یہ کام ہم نہیں ہونے دیں گے تو پھر کوئی شخص اپنی من مانی نہیں کرسکے گا۔ امام خمینی نے ایران میں مزاحمتی تحریک برپا کرکے جو کچھ کیا وہ کچھ اگر ہم چاہیں تو یہاں بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ضیاء الحق کے دور حکومت میں ایک مخصوص فرقے نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کا مطالبہ کیا اور وہ لوگ اس پر ڈٹ گئے۔ حالانکہ اس وقت ضیاء الحق کا مارشل لاء "بوڑھا" نہیں ہوا تھا بلکہ وہ "کڑیل جوان" تھا۔ لیکن ان کی متحد آواز نے اس وقت بھی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ناک رگڑوادی اور ان سے اپنا مطالبہ منوا کر دم لیا۔ یعنی اصل میں یہ کرنے کا کام ہے کہ مذہبی طبقہ عوامی سطح پر مزاحمتی تحریک برپا کرکے تبدیلی لائے۔ جبکہ ہمارے ہاں کی تمام سنی جماعتیں جن کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ یکسر "سن" ہیں' وہ ہمیشہ الیکشن کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔ الیکشنز کے نتیجے میں چند لوگوں کو نشستیں حاصل ہوجاتی ہیں اور وہ وی آئی پی بن جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے وہ اپنے ذاتی مفادات پورے کرتے ہیں۔ اسمبلیوں میں پہنچ کر ان ملاوی آئی پی کے ولیے بھی اسی معیار اور انداز میں ہوتے ہیں جیسے کسی برگر فیملی میں ہوتے ہیں۔ یعنی اسمبلیوں میں پہنچ کر یہ "ملا حضرات" "برگر" بن جاتے ہیں۔ یہ چند لوگ اسلام کے نام پر قوم کو بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہیں' بلکہ یہ لوگ اس ملک میں اسلام نہ آنے کے سب سے بڑے مجرم ہیں۔

○... سوال : "ذرا واضح کریں گے کہ آخر وہ کون سے لوگ ہیں؟"

☆... جواب : "نہیں' میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ سب لوگ ان چہروں سے آگاہ ہیں۔"

○... سوال : "اصل میں عوام نواز شریف اور بے نظیر دونوں کو ووٹ دے کر آزما چکے ہیں' شاید اسی لئے تیسری قیادت کا نعرہ لگایا جاتا ہے؟"

☆... جواب : "بھئی .... تیسری طاقت کے انتظار میں کئی سیاست دان بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ائرمارشل اصغر خان ملک میں تیسری قیادت لانے کی خواہش اور جدوجہد میں بوڑھے ہوگئے۔ بلکہ اب تو ان کی جماعت بھی بکھر کر رہ گئی ہے۔ بلکہ اب اس تیسری طاقت کے حصول کی جدوجہد میں ایک نیا اور جوان آدمی قاضی حسین احمد بھی آگیا ہے۔ قاضی حسین احمد صاحب بھی بوڑھے ہوجائیں گے لیکن وہ بھی تیسری قیادت نہیں لاسکیں گے۔"

○... سوال : "ڈاکٹر صاحب! آخر پھر تبدیلی کس طرح آئے گی؟"

☆... جواب : "تبدیلی کے لئے عوامی سطح پر مزاحمتی تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے لوگوں کو خون بہانا ہوگا اور اپنی جانیں دینا ہوں گی۔ دنیا میں آج تک تبدیلی یا انقلاب خون بہائے بغیر نہیں آیا۔ اصل میں یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا آپ حکومت بدلنا چاہتے ہیں یا نظام کی تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں۔ حکومت بدلنا تو قطعاً مشکل نہیں' یہ تو چند منٹوں میں بدل دی جاتی ہے لیکن نظام کبھی اس طرح نہیں بدلا جاسکتا۔ نظام اگر بدلنا ہے تو اس کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات اور لوگوں کے ذاتی مفادات ہوتے ہیں' اس لئے وہ تو کبھی بھی کسی کو اس نظام کے بدلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ امریکہ ہی میں دیکھ لیں کہ صرف غلامی کے خاتمے کے لئے انہیں کتنا خون بہانا پڑا تھا۔ اس لئے کسی بھی ملک میں نظام کی تبدیلی خون بہائے بغیر نہیں لائی جاسکتی۔"

○... سوال : "آپ خون بہانے کی جو بات کررہے ہیں' اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ لوگ انتظامیہ اور دیگر ملکی اداروں سے باقاعدہ جنگ کریں گے؟"

☆... جواب : "نظام بدلنے کے لئے لوگوں کو یکطرفہ طور پر جنگ کرنا پڑے گی۔ ایک جنگ دو طرفہ ہوتی ہے کہ جس میں دونوں فریقین مسلح ہوتے ہیں' لیکن یکطرفہ جنگ میں لوگ صرف مرنے کے لئے تیار رہتے ہیں جیسے کہ ایران میں کی گئی یعنی نظام کی تبدیلی کے لئے لوگ صرف مرنے کے لئے تیار رہیں۔ اس صورت میں حکومت آخر کتنے لوگوں کو مارے گی۔ کیونکہ ہماری فوج قابض نہیں بلکہ قومی امانت ہے۔ کچھ عرصے تک آرمی حکومت کا حکم مانے گی لیکن زیادہ دیر تک یہ بات نہیں چل سکے گی۔ مثلاً ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ ایران نے اسے اپنی حکومتی طاقت کے بل بوتے پر استعمال کرنے کی کوشش تو کی' لیکن زیادہ عرصے تک یہ بات نہیں چل سکی۔ کچھ عرصے بعد فوجیوں کو بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ جن لوگوں کو مارنے کی بات کہی جارہی ہے وہ ہمارے اپنے بھائی ہیں۔ لہٰذا فوج نے بھٹو صاحب کو بھی صاف جواب دے دیا تھا۔ حالانکہ چند روز پہلے مرحوم بھٹو نے ٹیلی ویژن پر اپنی نشری تقریر میں کرسی کے بازوؤں کو پکڑ کر کہا تھا کہ یہ بہت مضبوط ہے' لیکن یہ بات درست ثابت نہ ہوئی۔ یہ طریقہ ہے کہ جس کے ذریعے کچھ تبدیلی آسکتی ہے۔ لیکن اگر الیکشن کے ذریعے ہی "فرنٹ" بناکر حکومتیں بنانے کی کوشش کی گئی تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکے گا۔ اسی طرح اتحادی سیاست بھی اب دم توڑ رہی ہے۔"

○... سوال : "کیا نظام کی تبدیلی کے لئے تمام جماعتوں کو مل کر جدوجہد کرنا ہوگی؟"

☆... جواب : "نہیں.... نظام میں تبدیلی صرف کوئی ایک جماعت ہی لاسکے گی۔ اصل میں انقلاب صرف کوئی ایک جماعت ہی برپا کرسکتی ہے۔ ایسی جماعت کہ جس نے کوئی فکر اور انقلابی نظریہ دیا ہو۔ اس کی بنیاد پر لوگ جمع ہوئے ہوں اور انہوں نے ایک جماعت کا روپ دھارا ہو تو اس صورت وہ جماعت جب تک اتنی طاقتور نہیں ہوتی کہ وہ کوئی تصادم مول لے سکے اسے صرف تبلیغ اور اپنی فکر اور نظریئے کی اشاعت و ترویج کے لئے کام کرنا چاہئے۔ اس دوران ایسی جماعت کو زبانی طور پر نظام کی خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہنا چاہئے۔ لیکن جب وہ اتنی طاقت حاصل کرلیں کہ کوئی بڑا تصادم مول لے سکتے ہوں تو انہیں اس کا آغاز کسی ایک سرے سے کردینا چاہئے۔

اس کے لئے کوئی بھی طریقہ کار گر ثابت ہو سکتا ہے۔ مثلاً جیسے مہاتما گاندھی نے "نمک بناؤ تحریک" شروع کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ بھئی یہ سمندر تو پرماتما کا ہے اور ہم اس سے نمک بنا رہے ہیں۔ اس لئے یہ نمک بھی پرماتما کا ہوگا۔ اصل میں مہاتما گاندھی نمک نہیں بنا رہے تھے بلکہ انہوں نے اس طریقے سے برطانوی ہند کی ایکسائز پالیسی کو چیلنج کر دیا تھا۔ اس طریقے سے انہوں نے حکومت سے تصادم لینے کی ترکیب سوچی لیکن دوسری طرف انہوں نے حکومتی مظالم کا مسلح جواب نہیں دیا۔ لوگ جیلوں میں چلے گئے اور انہوں نے ماریں کھائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور کئی دوسرے لوگ اس تحریک کے دوران زخمی بھی ہوئے۔ یعنی اس طریقے سے انہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی بنیاد رکھ دی۔" O...سوال : "آپ ایک جماعت کے ذریعے انقلاب کی بات کر رہے ہیں' جبکہ ہمارے ہاں کوئی جماعت بھی عوامی حمایت کا دعویٰ نہیں کر سکتی' پھر آخر یہ تبدیلی کیسے آئے گی؟"

☆ ... جواب : "جو لوگ انقلاب اور نظام کی تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں' انہیں ایسی کوئی جماعت سامنے لانا پڑے گی۔ اس کے لئے کافی وقت بھی لگ سکتا ہے لیکن اس دوران وہ تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ نظام کی خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کے جذبات میں ہلچل مچا سکتے ہیں۔ نظام کو فوراً دھڑام سے نیچے نہیں گرایا جا سکتا۔ اسے کچھ عرصہ تو چلنا ہے البتہ اس میں آہستہ آہستہ ایک بہتری یہ آ رہی ہے کہ دو جماعتی نظام سامنے آیا ہے۔ یعنی گاڑی کسی حد تک پٹڑی پر چڑھی ہے۔ اب ان سب چیزوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں کتنی مہلت دی جاتی ہے۔ کیونکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ کیونکہ ملک اسلام کے نام پر بنا لیکن یہاں سوائے اسلام کے ہم سب کچھ لے آئے۔ لہٰذا پہلی بار اس کی سزا ہمیں ۱۹۷۱ء میں اس وقت ملی جب ملک دو لخت ہوا اور ترانوے ہزار پاکستانی اس ہندو کے قیدی بنے جن پر ہم نے برسہا برس تک حکومت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں یہ پہلا کوڑا لگایا گیا تھا۔ دوسرا کوڑا اس وقت مجھے بالکل ہمارے سروں پر پڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ یہ بونس ہمیں کب تک دیتا ہے اور کب اس کا عذاب ہمیں آگھیرتا ہے۔

یاد رکھیں ... اگر یہاں اسلام نہ آیا تو بہت جلد یہ کوڑا ہمارے سروں پر آن پڑے گا۔ اس عذاب کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً زمینیں پانی نہ ہونے کی وجہ سے بنجر بھی ہو سکتی ہیں اور بھارتی حملے کی صورت میں بھی عذاب ہم پر مسلط کیا جا سکتا ہے۔ "سورہ انعام" میں بھی اس عذاب کا ذکر ہے اور اس کی تین شکلیں بیان کی گئی ہیں' اس کے مطابق:

(۱) اللہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب تمہارے اوپر سے مسلط کر دے۔

(۲) اللہ تمہارے قدموں کے نیچے سے بھی عذاب نکال سکتا ہے۔

(۳) اللہ اس چیز پر قادر ہے کہ وہ تمہیں آپس میں ٹکرا دے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا دے۔

یعنی اللہ کو آسمان اور زمین کہیں سے عذاب نہ اتارنا پڑے بلکہ ہمیں آپس میں بھی لڑوا کر ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا سکتا ہے۔ اس لئے اگر کچھ مہلت مل جائے اور اس گئے گزرے نظام کے اندر رہتے ہوئے بھی کوئی بہتری ہو جائے تو ہمیں اس کے لئے پہل کر دینا چاہئے۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ پاکستان کے تمام مسائل کا اصل حل "اسلامی انقلاب" ہے۔ البتہ جب تک وہ انقلاب نہیں آتا اس وقت تک اس موجودہ انتخابی نظام کو جاری رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا دوسرا متبادل مارشل لا ہے اور وہ ملک و قوم دونوں کے لئے ناسور ہے۔ مارشل لاء ترکی کے لئے خطرناک نہیں ہے یہ صرف پاکستان کے لئے خطرناک ہے۔"

O...سوال : وہ کیسے؟"

☆ ... جواب : "مارشل لاء ترکی کے لئے اس لئے خطرناک نہیں ہے کہ وہاں تقریباً ایک قوم' نسل اور زبان ہے۔ لہٰذا اسی ایک قوم میں سے فوجی' سیاستدان اور بیوروکریٹس سب ہیں۔ اس لئے وہاں آ کر کسی ایک جماعت کو ہٹا کر دوسری جماعت کی حکومت بنا دی جائے تو پھر بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان میں نہ نسل ایک ہے اور نہ ہی زبان ایک بولی جاتی ہے۔ ہماری فوج ایک خاص علاقے سے ہے۔ جس میں بالائی پنجاب اور صوبہ سرحد کا کچھ حصہ شامل ہے۔ سندھ' بلوچستان اور سرائیکی علاقے سے فوج کا تعلق نہیں ہے۔ جبکہ سرائیکی علاقے پنجاب کا نصف ہیں۔ اس صورت میں جب بھی مارشل لاء آتا ہے تو لوگوں میں احساس ہوتا ہے کہ وہ علاقہ حکومت کر رہا ہے۔ یہ ردعمل پاکستان کے لئے بہت خطرناک ہے۔ اسی ردعمل کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے لوگوں میں منفی جذبات پیدا ہوئے۔ کیونکہ ایوب خان کے مارشل لاء دور میں مشرقی پاکستان کے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ انہیں ملکی معاملات سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ وجہ یہی تھی کہ فوج میں ان کے لوگ نہیں تھے۔"

O...سوال : "عوام میں نفاق اور تعصبات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

☆ ... جواب : عوام میں تعصبات کا فروغ عذاب الٰہی کی ایک شکل ہے۔ اللہ نے ہمیں گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ گروہ مذہبی' لسانی اور صوبائی ہر قسم کے ہیں۔ تعصبات اور گروہی سیاست کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔"

O...سوال : پاکستان نفاذ شریعت کے لئے حاصل کیا تھا.....؟"

☆ ... جواب : "نفاذ شریعت ایک بڑا محدود سا لفظ ہے بلکہ پاکستان نظام اسلام کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ نظام کبھی نافذ نہیں ہوتا یہ ہمیشہ قائم کیا جاتا ہے۔ قانون نافذ ہوتا ہے۔ شریعت بھی قانون ہے' اسی لئے شریعت کا نفاذ والی بات درست ہے جبکہ اسلام کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔"

O...سوال : بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر اسلام کیسے قائم کیا جائے گا؟"

☆ ... جواب : "ظاہر بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں تو اس لئے نماز پڑھنا چاہئے۔ اسی طرح عدلیہ اور دیگر معاملات اسلام کے مطابق طے ہونا چاہئیں۔ جو صرف نظام اسلام کے قیام سے ہی ممکن ہے۔ قرآن و سنت کی مکمل بالادستی ہونا چاہئے۔"

O...سوال : حصول پاکستان کی جدوجہد جن مقاصد کے لئے کی گئی تھی' وہ بھلا دیئے گئے۔ اس کی ذمہ داری کس کے سر جاتی ہے؟"

☆ ... جواب : "اس کی تمام ذمہ داری مسلم لیگ کے سر جاتی ہے۔ مسلم لیگ نے پاکستان کے قیام کے وقت لوگوں سے کچھ وعدے کئے تھے۔ شاید یہ اس کی حکمت عملی بھی ہو سکتی ہے کہ جب بھی قائداعظمؒ سے پوچھا جاتا تھا وہ صرف یہی جواب دیتے تھے کہ پاکستان میں نظام صرف اسلام کا ہوگا' دستور قرآن کا ہوگا۔ انہوں نے کبھی بھی اس کے بارے میں کوئی وضاحتی خاکہ پیش نہیں کیا۔ میرے نزدیک پاکستان کے مقصد سے ہٹنے کی ذمہ داری مذہبی عناصر پر بھی آتی ہے کہ انہوں نے اقتدار کے سیاسی کھیل میں شرکت کی اور اپنے اصل کام کو یکسر فراموش کر دیا۔"

O...سوال : "ڈاکٹر صاحب ..... آپ کی جماعت

انتخابی سیاست سے ہٹ کر جدوجہد کر رہی ہے۔ کامیابی کے کتنے فی صد امکانات نظر آتے ہیں"؟

☆ ... جواب : مجھے تو فوری طور پر کوئی کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے۔ ابھی تو لوگ انتخابی سیاست کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں اللہ کی نصرت سے مایوس نہیں ہوں' وہ انشاء اللہ جلد ہی لوگوں کو ہدایت دے گا۔ اگر لوگ اس طرف نہیں آئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ عذاب کی مہلت ختم ہو جائے۔"

O...سوال : "ہمارے سیاستدان عوامی مینڈیٹ حاصل کرنے کے بعد اسمبلیوں میں جا کر اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

☆ ... جواب : "اصل میں سیاستدانوں کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے۔ کردار کی پختگی نہیں ہے۔ انہوں نے سیاست کو اپنا کاروبار بنا رکھا ہے۔"

O...سوال : "اپوزیشن کی طرف سے الزام لگایا جاتا ہے کہ صنعت کار طبقے کو کارنر کر کے جاگیرداروں کو عوام کے سروں پر مسلط کر دیا گیا ہے؟"

☆ ... جواب : "ویسے موجود اپوزیشن جس کا بڑا حصہ نواز شریف اور ان کے ساتھی ہیں' کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا ہے۔ میں بھی اس الزام کو درست سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر ہم جائزہ لیں تو موجود سیٹ اپ میں صنعت کار طبقے کو دھکیل کر جاگیرداروں کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ ایک فرق ہے ورنہ نواز شریف اور بے نظیر کی جماعتوں میں دینی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔"

O...سوال : "آپ ان دنوں کراچی آئے ہیں جہاں پورے صوبہ سندھ میں آپریشن کلین اپ جاری ہے۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

☆ ... جواب : آپریشن کلین اپ مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ بدامنی اور ہنگامہ آرائی کے لئے فوج کا آپریشن کلین اپ فوری طور پر کارگر ہو سکتا ہے لیکن یہ مستقل حل نہیں ہوتا۔ مستقل حل تو سیاسی و اخلاقی سطح پر ہو گا۔ لوگوں کے اندر ایک قوم ہونے کا تصور پیدا کرنا ہو گا۔ ان میں پائی جانے والی احساس محرومی کو ختم کرنا ہو گا۔"

O...سوال : "کراچی میں مذہبی جماعتوں کے عمل دخل کو ایم کیو ایم کی لسانی سیاست نے ختم کر دیا' اس کی کیا وجہ ہے؟"

☆ ... جواب : "یہ تو حالات کا ردعمل ہے' کیونکہ اگر تمام مسائل حل ہو جائیں تو پھر ان باتوں کی گنجائش نہیں رہتی۔"

O...سوال : "مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں آپ کیا سوچ رکھتے ہیں؟"

☆ ... جواب : "پاکستان اور بھارت دو بار اس مسئلے کی وجہ سے جنگ بھگت چکے ہیں اور اب بھی اگر دانشمندی کا مظاہرہ نہ کیا گیا تو نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ کشمیر اب اس خطے کی سالمیت کے لئے بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کو اس مسئلے کا کوئی مثبت حل تلاش کرنا چاہئے۔ اس حوالے سے کوئی درمیانی راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ انتہاپسندی کوئی حل نہیں ہے۔ امریکہ کی تو خواہش ہے کہ کشمیر کو خود مختار ریاست بنا کر پاکستان اور بھارت کے درمیان بفر زون قائم کر دیا جائے۔ ہمیں اس خطرے کا تدارک کرنا ہو گا۔ جس کے لئے دونوں ممالک کے درمیان باہمی مذاکرات کی ضرورت ہے۔ خود مختار کشمیر پاکستان اور بھارت دونوں کے لئے خطرے کی بنیاد ہو گا۔ اب تو بھارتی دانشور امریکہ کی اس چال کو سمجھ گئے ہیں۔ ان کی طرف سے بھارتی حکومت کو اس مسئلے کی نزاکت کا احساس دلایا گیا ہے اور بھارت کشمیری عوام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے' اس کے نتائج سے باخبر کیا گیا ہے۔ پاکستانی دانشور بھی حکومت کے سامنے کوئی مثبت راہ نکالنے کے لئے تدابیر پیش کریں تاکہ بھارت اور پاکستان دونوں ممالک کے حکمران اس مسئلے پر مثبت سوچ قائم کر سکیں۔

O...سوال : "امریکی چال ہے کہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے بدلے مسئلہ کشمیر حل کروا دیا جائے۔ کیا خیال ہے؟"

☆ ... جواب : "آخر امریکہ اس مسئلے کا کیا حل دے سکتا ہے؟ وہ تو سوائے خود مختار کشمیر کے کوئی اور بات نہیں کرے گا۔ جوہری پروگرام ہماری بقا کا ضامن ہے۔ اس کے بدلے ہم کسی قسم کا کوئی حل قبول نہیں کر سکتے۔ کشمیر اور جوہری پروگرام دونوں ہماری چیزیں ہیں' یہ امریکی میراث یا جاگیر نہیں کہ وہ اس کے حل کی تدبیر کرے۔ اس لئے بھارت اور پاکستان کو خطے کے استحکام اور عوامی خوشحالی کے لئے باہم مل بیٹھ کر کام کرنا ہو گا۔ کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت مسائل کو بڑھانے کا باعث ہو گی۔"OO

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں

نبی اکرم کی اصل علالت قدر اور عظمت شان کو کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
ہمارے لیے اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں یا نہیں
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دارومدار ہے
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اسے پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے
ہدیہ فی نسخہ: تین روپے تبلیغی مقصد کے لیے یکصد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا

شمالی علاقہ جات میں پندرہ روزہ دعوتی پروگرام

تحریک خلافت پاکستان حلقہ راولپنڈی ڈویژن کے زیراہتمام پندرہ جون بروز بدھ سے تیس جون بروز جمعرات تک ایک پندرہ روزہ دعوتی و تربیتی پروگرام ترتیب دیا جا رہا ہے۔ اس پروگرام کے شرکاء کا یہ قافلہ راولپنڈی سے روانہ ہو کر ہری پور' ایبٹ آباد' مانسہرہ' بیشام' دوسو اور چیلاس سے ہوتا ہوا گلگت پہنچے گا۔

شرکت کے خواہش مند معاون حضرات اپنا نام دفتر تحریک خلافت راولپنڈی ۴۴۔ بی سیٹلائٹ ٹاؤن کے پتے پر ۱۰ جون تک پہنچا دیں۔

طعام کا خرچہ شرکاء کے ذمے ہو گا۔

شمس الحق اعوان
ناظم تحریک خلافت' راولپنڈی' فون: ۴۲۷۵۴۰

رچرڈ نکسن کی کتاب "سیزدی مومنٹ" کے ایک باب کا ترجمہ (آخری قسط)

امریکہ نے اپنی اسرائیل پروری پر کبھی پردہ نہیں ڈالا

ترجمہ : فہیم صدیقی

یروشلم شہر کی تقسیم پر اب بات نہیں ہو سکتی

مغرب کو اس احسان کا بدلہ چکانا چاہئے جو مسلمانوں نے اس پر کیا تھا

آنجہانی رچرڈ نکسن کی کتاب "سیزدی مومنٹ" کے ایک باب "دی مسلم ورلڈ" کا ترجمہ اس قسط میں مکمل ہو گیا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ وہ قومیں جنہیں دنیا میں اپنے لئے کوئی مقام پیدا کرنا یا اسے برقرار رکھنا مقصود ہوتا ہے' اپنی سیاسی حکمت عملی مرتب کرنے میں کس باریک بینی اور دور اندیشی سے کام لیتی ہیں۔ سابق امریکی صدر نے اگرچہ کہیں کہیں مسلمانوں کے حق میں کلمہ خیر بھی کہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر امریکی صدر کی طرح ان کا اصل مسئلہ بھی اسرائیل کی سلامتی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہی تھا اور اسی کی تمہید باندھنے کے لئے انہوں نے مسلم دنیا کا ذکر اتنی تفصیل سے کیا۔ ایک خاص بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ امریکہ نے عرب اسرائیل تنازع میں بالکل وہی کردار ادا کیا ہے جو مصنف نے تجویز کیا تھا اور واقعات نے ٹھیک وہی رخ اختیار کیا جس کی نشاندہی اس نے کتاب کے متعلقہ باب میں کی گئی تھی حالانکہ یہ تحریر لکھتے ہوئے وہ امریکہ کے ارباب حل و عقد میں شامل نہیں تھے اور دریں اثناء نہ صرف امریکہ کا صدر بدل گیا بلکہ حکمران پارٹی بھی بدل گئی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کم از کم خارجہ پالیسی میں ایک ایسا تسلسل پایا جاتا ہے جس میں کسی کے آنے جانے سے کوئی قابل ذکر فرق واقع نہیں ہوتا..... تاہم یہ باتیں اہل پاکستان کی سمجھ میں آنے والی نہیں جہاں ہر آنے والا حکمران ہر جانے والے کو ملک دشمن اور غدار قوم بلکہ قوم فروش قرار دیتا ہے اور کرے خواہ وہی کچھ جو پہلے نے کیا' اعلان یہ کرتا ہے کہ "وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہو گا"..... مدیر

امریکی ثالثی کے ذریعہ امن سمجھوتے کی کسی بھی کوشش کے چار مقاصد ہونے چاہئیں:

۱۔ پڑوسی ممالک کا اسرائیل کو پوری طرح تسلیم کرنا۔

۲۔ اسرائیلی سرحدوں کے تقدس کی مکمل بحالی۔

۳۔ ان عرب علاقوں کی واپسی جن پر ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا گیا۔

۴۔ فلسطینیوں کے لئے داخلی حکومت خود اختیاری۔

ماضی میں عارضی معاہدے جن میں سے بعض پر ۱۵ سال سے زائد عرصہ عمل درآمد ہوتا رہا' اسرائیل کو تسلیم کرنے کے معاملے کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ یہ صورت حال اب قابل قبول نہیں۔ اگر عرب رہنما ۴۴ سال بعد بھی اسرائیل کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی پائیدار امن کے خواہشمند نہیں ہیں بلکہ صرف عارضی صلح چاہتے ہیں۔

اسرائیل کو دو طرح کے خطرات کا سامنا ہے جن کا دفاعی انتظامات میں خاص خیال رکھنا ہو گا۔ ایک روائتی ہتھیاروں سے لیس کسی فوج کا باقاعدہ حملہ اور دوسرے چھوٹے پیمانے پر گوریلا جھڑپیں اور دہشت گردوں کی کارروائیاں۔ پہلی صورت کا مقابلہ کرنے کی غرض سے امریکہ کو دو سطحوں پر کام کرنا چاہئے۔ پہلی یہ کہ اگر اسرائیل عرب علاقے واپس کر دے تو امریکہ کو اسرائیل سے باقاعدہ دفاعی معاہدہ کرنا چاہئے جس کی رو سے اسرائیل پر حملہ امریکہ پر حملے کے مترادف ہو۔ خلیجی جنگ کے بعد ہمارے اس رویہ پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارا نہ ہی کویت سے کوئی معاہدہ تھا نہ ہی کوئی خصوصی ہمدردی اور نہ ہی اس سے کوئی خاص ہمدردی لیکن اس کے باوجود ہم نے کویت کو آباد کرانے کے لئے اپنی اتنی افرادی قوت کو کرہ ارضی کے دوسری جانب منتقل کیا جو تعداد میں ہمارے میڈیسن اور وسکونسن جیسے دو شہروں کی آبادی کے برابر تھی۔ صدر بش کو اگرچہ کانگریس اور سینٹ سے اس کی منظوری کے لئے کچھ کاوش کرنی پڑی لیکن اگر کبھی اسرائیل کا معاملہ درپیش ہوا تو عوامی نمائندے آنکھ بند کر کے حکومتی اقدام کی حمایت کریں گے۔

دوسری سطح پر امریکہ کو ایسی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی کہ مقبوضہ علاقوں کی واپسی سے اسرائیل کے رقبے میں جو کمی واقع ہو اس کا کوئی برا اثر اس کی سلامتی پر نہ پڑنے پائے۔ مثلاً ان علاقوں میں جو اسرائیل واپس کرے روائتی ہتھیاروں سے مسلح فوجوں کی موجودگی ممنوع قرار دے دی جائے جو جارحیت کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ جولان کی بلندیوں اور مغربی کنارے کو عملاً بفرزون بنا دیا جائے جبکہ شام جولان کا انتظام اپنے پاس رکھے اور اردن مغربی کنارے کا۔ تاہم کوئی بھی ملک ان علاقوں میں اپنی فوجیں نہیں رکھے گا اور اس طرح یہاں سے گولہ باری یا کسی بھی جارحانہ حملے کے آغاز کا سدباب ہو جائے گا۔ جنگ بندی کے موجودہ خط پر عرب فوجوں کی تعداد میں معتدبہ کمی پر بھی اصرار کیا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ بین الاقوامی یا (امریکہ' اسرائیل اور عرب لیگ پر مشتمل سہ طاقتی نگرانی میں مصروں کی تعیناتی پر بھی غور ہو سکتا ہے جو فوری طور پر خبردار کرنے کی غرض سے چوکیاں بنا کر فریقین کو بروقت اطلاع دے کہ اچانک حملہ کر کے بفرزون پر قبضہ تو نہیں کیا جا رہا۔ ایک بین الاقوامی فوج بھی جو صرف مبصر کی حیثیت ہی نہیں بلکہ کسی بھی جارح کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو' متعین کرنے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ یوں اسرائیل مقبوضہ زمین کے بدلے امن کے سمجھوتے کے ذریعے اپنی سلامتی کو

خطرہ میں نہیں ڈالے گا بلکہ اس کی بدولت پہلے سے زیادہ محفوظ و مامون ہو جائے گا۔

گوریلا حملوں اور دہشت گردی کے واقعات کا معاملہ البتہ مشکل اور پیچیدہ تر رہے گا۔ اسرائیلی تشدد پسندوں کا خیال ہے کہ مغربی کنارے کی واپسی کے بعد بے قاعدہ فلسطینی فوج اسرائیلی شہروں پر چھوٹی توپوں یا ایسے راکٹوں کے ذریعے جو آسانی سے چھپائے جاسکتے ہیں' اسرائیلی شہروں پر سرحد یا چند میل سے حملے کرتی رہے گی۔ لیکن دفاعی انتظامات کے ذریعہ اس کا بھی مداوا ہو سکتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں جنگ بندی لائن پر موجود اسرائیلی فوجی چوکیاں مغربی کنارے میں اردن کی سرحد سے چھوٹے ہتھیاروں کی آمد کی جو روک تھام کرتی ہیں' اس انتظام کو بین الاقوامی عملہ جس میں اسرائیل بھی شامل ہو' زمینی داخلے کے مقامات اور ہوائی اڈوں پر برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ امن معاہدہ میں یہ شق رکھی جاسکتی ہے کہ اگر ایسی کوئی کارروائی واپس کئے گئے علاقوں سے ہوئی تو اسرائیل کو جوابی کارروائی کرنے کا حق ہو گا جس کے باعث اردن اور فلسطین کے رہنما اپنے عوام کو کنٹرول میں رکھیں گے۔

کیمپ ڈیوڈ فارمولے کے تحت امریکہ فلسطینی داخلی خود اختیاری کے مسئلے کو اردن کے اشتراک سے حل کر سکتا ہے جس میں اس ذیلی اقتدار کی منتقلی بتدریج کئی سالوں پر محیط ہو۔ اس کے لئے اگرچہ شاہ حسین کو مغربی کنارے پر اپنے ۱۹۸۸ء کے دعوے سے دست بردار ہونا ہو گا تاہم اتنی لچک پیدا کر لینا مشرق وسطی کی سیاست میں کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ دریں اثناء مقبوضہ علاقوں میں انتخابات کے ذریعہ ایسے فلسطینی نمائندوں کو چنا جائے جو امن بات چیت میں فلسطینیوں کی نمائندگی کریں۔ اسرائیل ان نمائندوں کی اپنی طرف سے پیشگی منظوری پر اصرار کرتا رہا ہے تاکہ ایسا کوئی بھی شخص ان میں شامل نہ کیا جائے جس کا قریبی یا دور کا بھی تعلق پی ایل او سے ہو۔ اس کا یہ اصرار مناسب نہیں ہے۔ خود ہم نے اسٹالین یا اس کے جانشینوں سے مذاکرات کبھی پسند نہ کئے لیکن مجبوری تھی کہ انہی لوگوں سے بات کی جائے جن کے ہاتھوں میں زمام کار ہے۔ جب تک اسرائیل اپنے دشمنوں سے معاملات طے نہیں کرتا' کوئی بھی امن معاہدہ اس کی حفاظت کا ضامن نہیں بنے گا۔

اسرائیلی اور فلسطینی دونوں انتہا پسندوں کو اپنی مہم جوئی ترک کرنی ہوگی۔ ۱۹۶۷ء سے قبل کی اسرائیلی سرحدوں میں انہیں محفوظ کرنے کی غرض سے تھوڑا بہت رد و بدل تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسرائیل کو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اپنی نئی آبادیوں سے دستکش ہونا پڑے گا۔ دوسری طرف فلسطینیوں کو بھی یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ ۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد سے وہ مہاجرین جن کی تعداد اب بتیس لاکھ ہے' اسرائیل میں اپنے گھروں کو واپس نہیں جائیں گے اور یہ حقیقت پی ایل او کے رہنما اپنے بیانات میں کسی حد تک تسلیم کر بھی چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسرائیلی جو مقبوضہ علاقوں سے واپس کئے جائیں اور وہ فلسطینی جن کے گھر بار اسرائیل میں رہ گئے دونوں کو اپنی املاک کا مناسب معاوضہ ملنا چاہئے۔ ہمیں سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں بلکہ جاپان کو بھی اس کے لئے سرمایہ کی فراہمی پر راضی کرنا ہو گا۔ مشرقی یروشلم کے کنٹرول کا معاملہ جس کی جذباتی و مذہبی اہمیت دونوں کے لئے یکساں ہے' آسانی سے طے نہیں ہو گا۔ اسرائیل مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات کو سب کے لئے کھول تو سکتا ہے لیکن ۱۹۶۷ء سے پہلے کی حد بندی پر شہر کی تقسیم پر اب کوئی بات بھی نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا خطوط پر کوئی سمجھوتہ دونوں فریقوں کے مفادات کا محافظ تو ہو گا تاہم حفاظتی تدابیر کے سلسلے میں مندرجہ بالا کوئی بھی رائے الہامی نہیں۔ یہ صرف ایک ممکنہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعہ اسرائیل کی سلامتی اور امن کے لئے مقبوضہ زمین کی واپسی سے وابستہ مشکل مسائل پر گفتگو کی سبیل بہرحال نکالی جاسکتی ہے۔

امریکہ کی حکمت عملی کا تقاضہ ہے کہ قیام امن کے عمل کے دوران ہمیں کوئی جامع امن منصوبہ از خود پیش نہیں کرنا چاہئے ورنہ دونوں فریق اسے فوراً رد کر دیں گے۔ ہمیں تو فریقین کے ساتھ وسیع تر تناظر میں بات چیت کر کے اپنی اپنی سلامتی کے انتظامات کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنے چاہئیں۔ جس کے بعد ہی ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کس قسم کا سمجھوتہ منصفانہ اور قابل عمل ہو گا۔ جب ایسے کسی سمجھوتے کے بنیادی خطوط کا تعین ہو جائے تب ہی ہم وہ قواعد و ضوابط مرتب کر سکیں گے جو ایک رسمی معاہدے کو الفاظ و معانی کا مشکل جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہیں۔ اس مرحلے میں ہمیں فریقین پر دباؤ ڈال کر ان کے موقف کو زیادہ سے زیادہ لچک دار بنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ہمارا دباؤ گو کہ محدود ہے لیکن بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسرائیل کو روسی یہودیوں کی آبادکاری کے لئے اربوں ڈالر درکار ہیں جبکہ اعتدال پسند عرب ممالک' مصر' سعودی عرب' خلیجی ریاستوں اور اردن کو بھی امریکی ہتھیاروں اور دفاعی انتظامات میں ہمارے تعاون کی ضرورت ہے اور شام پر سعودی عرب اور ماسکو دباؤ ڈال سکتے ہیں۔

ہمیں کوئی سمجھوتہ ٹھونسنے کی ضرورت نہیں' فریقین کو صرف ان شرائط معاہدہ کی افادیت کا قائل کرنا ہے جبکہ مشرق وسطی کی کشمکش اقتدار میں اس غرض کے لئے گفتگو کے فن سے ہی کام نہیں چلتا۔ چنانچہ ضدی اور خود سر عرب رہنماؤں کو یہ بھی باور کرانا ہو گا کہ امریکہ ان کے ملک کے ساتھ اچھا یا برا کیا کچھ کر سکتا ہے۔ قیام امن کا عمل اسی وقت آگے بڑھا کرتا ہے جب فریقین اس بات کو سمجھ لیں کہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے مقابلہ میں کسی نہ کسی مصالحت پر پہنچ جانا زیادہ مفید ہے۔ انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ امریکہ موجودہ صورتحال جوں کا توں رکھنے کو مجوزہ سمجھوتے کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ بنانے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔

اب جبکہ فریقین عرب اسرائیل امن مذاکرات کی جانب بڑھ رہے ہیں' امریکہ کے پالیسی سازوں کو مندرجہ ذیل پانچ بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھنا چاہئے:

☆ - بنیادی مسئلہ پر زور دیں نہ کہ مذاکرات کی "کارروائی ڈالنے" پر۔ بڑی مشکل سے عربوں اور اسرائیل کو مذاکرات کی میز پر لے ہی آیا گیا ہے تو بات چیت کو کسی بھی وقت فروعی باتوں کے دلدل میں دھنسنے نہ دیا جائے۔ اہمیت اس بات کو دی جانی چاہئے کہ اصل فیصلہ کن معاملات کیا ہیں۔ مشرق وسطی کے سبھی رہنما رعایت دینے کے معاملہ کو طریق کار کی غیر ضروری تفصیلات میں الجھانے کے ماہر ہیں چنانچہ یہ خیال کہ فریقین آمنے سامنے بیٹھ کر مذاکرات کے ذریعہ امن سمجھوتے پر پہنچ سکتے ہیں اگرچہ خوش آئند ہے لیکن قطعی غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ مسئلہ یہ تو ہے ہی نہیں کہ اسرائیل اور اس کے پڑوسیوں کے درمیان افہام و تفہیم کا فقدان ہے کیونکہ در حقیقت دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اصل مشکل یہ ہے کہ دونوں کی خواہشات ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ عرب امن کی ضمانت دیئے بغیر اپنے علاقوں کی واپسی چاہتے ہیں جبکہ اسرائیل مقبوضہ علاقوں پر تسلط سے باز آئے بغیر امن چاہتا ہے۔ شام اور اسرائیل کو یہ بتانے کے لئے

آمنے سامنے بیٹھنے کی آخر کیا ضرورت ہے کہ جولان کی بلندیوں کی ضرورت دونوں کو ہے؟۔

☆ - کوشش مرحلہ وار حل کی ہونی چاہئے نہ کہ مکمل اور جامع معاہدہ کی۔ امن کی کوششوں میں کامیابی بڑی چھلانگوں کی شکل میں نہیں ہوا کرتی' اس کی طرف چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ ہر فریق ایک مسئلہ کو دوسرے سے منسلک کرنے کی کوشش کرے گا۔ مثلاً شام' اسرائیل کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرے گا جب تک فلسطین کے مسئلہ کا کوئی حل نہ نکلے۔ گویا کسی ایک سمجھوتے میں فریقین کے مابین برسوں کی کشیدگی سے پیدا ہونے والے مختلف نوعیت کے مسئلوں کا حل نہیں سمویا جاسکتا لہٰذا بہتر یہ ہے کہ امن کوششوں کی ابتدا ایک مختصر ایجنڈے سے ہو جس میں ایسے اہم بنیادی مسائل کو ہی لیا جائے جن میں کامیابی کے امکانات روشن اور قابل حصول ہوں۔

☆ - مذاکرات کے دوران مکمل رازداری سے کام لیا جائے۔ اگرچہ امریکی عوام صدر ولسن کے اس مشہور مقولے سے جبلی طور پر اتفاق کرتے ہیں کہ کھلے معاہدے کھلے طریقے سے تکمیل کو پہنچنے چاہئیں تاہم امن کی کوششوں کے دوران رازداری ناگزیر ہے۔ جب تک معاہدے کی شرائط راز میں نہ رہیں تب تک کوئی بھی فریق کھلے اتفاق کے لئے تیار نہیں ہوتا کیونکہ رازداری کے بغیر ان میں سے کوئی بھی مختلف مصالحتی فارمولے پیش کرنے کی حیثیت میں نہیں ہوگا۔ اگر مذاکرات کے دوران فریقین کے موقف اخباری نمائندوں کے ذریعہ عوام کو معلوم ہوجائیں تو اندرون ملک ناقدین اپنے نمائندوں کے خلاف طوفان کھڑا کرکے مذاکرات کی میز پر دونوں فریقوں کو اپنے آخری وانتہائی مطالبات لے کر آنے پر مجبور کردیں گے۔

☆ - مذاکرات اعلیٰ ترین سطح پر ہونے چاہئیں۔ ثالثی میں کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلسل' عملی اور براہ راست انداز میں امریکی صدر کی شخصیت اس میں ملوث ہو۔ سیکریٹری خارجہ بھی یہ کام انجام تو دے سکتے ہیں لیکن صدر کو یہ واضح کردینا ہوگا کہ سیکریٹری خارجہ ان کی ذاتی منظوری سے اس عمل میں شریک ہیں۔ یہ طریقہ ۱۹۷۸ء میں کیمپ ڈیوڈ کے تاریخ ساز معاہدہ کے سلسلے میں آزمایا گیا۔ اگر اسسٹنٹ سیکریٹری یا صدر کے نامزد نمائندوں کے ذریعہ امن کے لئے کوششیں کی گئیں تو مشرق وسطیٰ کا کوئی لیڈر ان کوششوں کو سنجیدگی سے نہیں لے گا۔ تاریخ ایسے سفارتکاروں کی ناکامیوں کے ذکر سے بھری پڑی ہے جنہوں نے عرب اسرائیل عداوت کی چٹان توڑنے کی کوشش کی لہٰذا صرف اعلیٰ سطحی مذاکرات ہی کامیابی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں۔

☆ - طویل المیعاد کوشش کے لئے تیار رہا جائے۔ جبکہ ۱۹۷۴ء میں جنگ بندی سمجھوتے کے حصول میں ہنری کسنگر کو چار ماہ تک مسلسل ادھر سے ادھر کے چکر لگانے پڑتے تھے ۱۹۷۸ء میں متواتر گیارہ ماہ کی کوششوں کے نتیجہ میں مصر' اسرائیل اور امریکہ نے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر دستخط کئے جس کے دوران اعلیٰ ترین سطح کے دو اجلاس بھی ہوئے تھے۔ صحرائے سینا کی جغرافیائی حیثیت کے پیش نظر اس سمجھوتے میں مشکلات اور پیچیدگیاں کم تھیں اور اس کے مقابلے میں باقی ماندہ مقبوضہ علاقوں کا مسئلہ بہت زیادہ الجھا ہوا ہے۔ چنانچہ کسی بھی سمجھوتے پر پہنچنے کے لئے ایک صبر آزما کوشش کی ضرورت ہوگی' بارش کے چھینٹوں کی طرح کے مذاکرات سے کام نہ چلے گا۔ مذاکرات کو فیصلہ کن مرحلے میں داخل کرنے کے لئے بہترین وقت وہ ہوگا جب امریکہ کے صدارتی انتخاب سر پر نہ ہوں کیونکہ صدارتی انتخابات کے سال میں یہاں کا سیاسی دباؤ اس عمل میں رکاوٹیں کھڑی کردے گا۔

عرب اسرائیل تنازعہ سے نپٹتے ہوئے ہمیں بین الاقوامی زندگی کی اس اہم حقیقت کا ادراک ہونا چاہئے کہ کوئی بھی معاہدہ ریاستوں کے طور طریقوں یا کردار کو تو تبدیل کرسکتا ہے لیکن عوام کے رویوں کو نہیں بدلا کرتا۔ مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عرب اور اسرائیل ایک دوسرے کو پسند کرنے لگیں گے' ان کے مابین صدیوں سے نفرت چلی آتی ہے اور وہ برقرار رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ انہیں اپنے تمام تر اختلافات کے ساتھ بھی پر امن زندگی گزارنے کا سلیقہ آجائے۔ گویا ایک پائیدار سمجھوتے کا تقاضہ یہ ہونا چاہئے کہ انہیں مضبوط دفاعی حد بندیوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا کرکے یہ احساس دلا دیا جائے کہ آئندہ کسی بھی جارحانہ مہم جوئی سے جارح فریق کو فائدہ کی بجائے ایسا شدید نقصان پہنچے گا جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔

اگر ہمیں مسلم دنیا سے اپنے تعلقات کو مستحکم کرنا ہے تو ہمیں ان لوگوں کو احترام اور اعتماد سے نوازنا ہوگا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی طاقتوں نے ان کے معاملے میں تعصب برتا اور ان کا استحصال کیا۔ آج صرف دو ہی مسلم ممالک ایسے ہیں جہاں جمہوری حکومتوں کی عملداری ہے تاہم ہماری تہذیب مسلم تہذیب سے برتر ہرگز نہیں۔ مسلم دنیا کے عوام کا رویہ کیمونزم کے خلاف مغربی اقوام کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت اور بے لچک رہا ہے جبکہ مغربی تہذیب کی مادیت پرستی اور اخلاقی بے راہ روی کو بھی انہوں نے بالعموم مسترد کردیا اور یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے۔

۷۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک تقریباً پانچ صدیوں تک مسلم دنیا نے سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے عیسائی دنیا کو قیادت فراہم کی' معیار زندگی بلند کیا' مذہبی رواداری سکھائی' قوانین کو قابل عمل بنایا اور اسے فلسفہ' سائنس اور تمدن سے روشناس کیا لیکن پھر عشروں پر محیط جنگ وجدل نے پانسہ پلٹ دیا۔ ڈورنٹ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "مغرب نے صلیبی جنگوں میں ہزیمت اٹھائی لیکن عیسائی عقائد کی بازی جیت لی۔ عیسائی لشکر یہودیت اور عیسائیت کی مقدس سرزمینوں سے نکال دیئے گئے لیکن ان کامیابیوں کے حصول میں مسلمانوں کا بھی اتنا خون بہہ گیا کہ پھر منگولوں کی یلغار نے انہیں تباہ و برباد کرکے رکھ دیا اور وہ گمنامی اور مفلسی کے اندھیرے دور میں گم ہوگئے۔ دریں اثنا شکست خوردہ مغرب نے ان مہمات سے سبق سیکھ کر اور اپنی شکست کو فراموش کرتے ہوئے اپنے دشمن کے قائم کئے روشنی کے میناروں سے بھرپور استفادہ کیا۔ گرجوں کی عمارات آسمان سے باتیں کرنے لگیں' غور و فکر کے سمندروں میں دور دور تک غوطہ زنی کی گئی' دانتے' چاسر اور ولن جیسے فلسفیوں کی وضع کردہ اصطلاحات میں بات کرنے کی عادت ڈالی اور بلند عزائم کے ساتھ احیائے علوم کے دور کا آغاز کیا"

جیسے مشرق کے علم و فضل نے مغرب میں احیائے علوم کی داغ بیل ڈالی تھی ویسے ہی اب وقت آگیا ہے کہ مغرب بھی مسلم دنیا کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کردار ادا کرے۔ اگر ہم مسلم دنیا کی تجدد پسند معتدل ریاستوں کے ساتھ مکمل اور برابر کے حصہ داروں کا سا معاملہ کریں اور مشرق وسطیٰ کی سلامتی کے پیچیدہ مسئلہ کو حل کرلیں تو ہم ایسی ایک نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ اگر مل جل کر کام کیا جائے اور ہم اپنی اپنی تہذیبوں کی خوبیوں کو باہم منسلک کرلیں تو ہماری معاصر تاریخ کا اگلا دور تعمیری اشتراک و تعاون سے عبارت ہوگا' تخریبی محاذ آرائی سے نہیں۔OO

نہیں کہہ سکتا کہ اسے اپنی ان گنت محرومیوں میں شمار کروں یا خیر مناؤں کہ میرا واسطہ علماء و مشائخ سے اتنا کم پڑا جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی گود میں پایا' مولانا مودودی مرحوم و مغفور کا فکر گویا گھٹی میں پڑا تھا جس کے بیشتر مثبت اور کم تر منفی پہلو تو بہت بعد میں جا کر کھلے لیکن تعصب و حمیت نے لڑکپن میں ہی دل و دماغ میں مورچہ کھود لیا تھا۔ جماعت کے لوگ لاکھ اس کی تردید کریں اور کتنی ہی وضاحتیں بھی پیش کر سکیں' واقعہ بہرحال یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے متاثر ہونے والے کسی بھی ذہنی سطح کے فرد کے لئے طبقہ علماء سے کوئی عقیدت بلکہ حسن ظن تک برقرار رکھنا تقریباً ناممکن تھا اور آج بھی ہوگا۔ یہ بات جماعت کے لٹریچر میں اگرچہ کہیں صاف لفظوں میں لکھی ہوئی تو نہیں' نہ ہی تنظیمی ہدایات پر مشتمل کسی سرکلر میں موجود ہے تاہم بین السطور ہر جگہ پڑھا جا سکتا ہے کہ خیر القرون سے متصل مختصر دور کے بعد سے چونکہ ہمارے متقدمین و اکابرین نے "اقامت دین" کے بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینے میں عافیت جانی اور منبر و محراب یا بعد ازاں مدرسہ و خانقاہ تک اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا لہٰذا ذاتی نیکی و پرہیزگاری' علمی خدمات اور اسلام کو ہم متاخرین تک پہنچا دینے کے احسان عظیم پر انہیں خراج تحسین پیش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن بہرحال اس اسلام کی تاریخ میں علماء مشائخ کو کوئی اعلیٰ و ارفع مقام نہیں دیا جا سکتا جو "تحریک" سے عبارت ہے۔

پہلے تو میں تھا ہی کنویں کا مینڈک' عملی طور پر جماعت اسلامی سے کٹنے اور دنیا کے دھندوں میں گردن تک دھنس جانے کے بعد بزرگان دین سے ربط و ضبط کے مواقع بالکل ہی ناپید ہو گئے' اس پر مستزاد ذہن کی وہ ساخت تو مستقل تھی ہی جو لڑکپن میں ہی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی' نتیجہ بہرصورت یہ نکلا کہ بزرگان دین سے صحبت نہیں رہی۔ البتہ اب سیرت مطہرہ کے مطالعے' قرآن مجید کے آئینے میں حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور آپؐ کی مثالی انقلابی جدوجہد کے طائرانہ مشاہدے اور پھر کچھ ہم عصر شخصیات سے سرسری تعارف کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جلال و جمال ربانی کے عکس کامل اور حسین ترین مرقع تو محمد رسول اللہ ﷺ فداہ امی وابی' ہی تھے اور قیامت تک کسی اور انسان میں اس حد درجہ متوازن امتزاج کی تلاش کار عبث ہے تاہم الگ الگ بعض خصوصیات کہیں نہ کہیں دیکھنے میں ضرور آجاتی ہیں جو حسن اتفاق سے ہمارے زمانے کی کسی جامع شخصیت میں بھی ایک حد تک اکٹھی پائی جائیں تو توازن سے بہرحال عاری ہوتی ہیں۔ ہر صاحب فہم و ذکا اپنے مشاہدات کے بل پر شخصیات کے تجزیئے کی غرض سے کچھ اصول وضع کر لیا کرتا ہے' مجھ عامی میں اس کی تو اہلیت نہیں البتہ کام چلانے کے لئے ایک "تھمب رول" بنا لیا ہے کہ بزرگان و اکابرین دین میں سے جو حضرات خلوص و اخلاص کے ساتھ دین کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کے لئے زندگیاں وقف کر دیتے ہیں' ان کی شخصیت پر جمال ربانی کا پرتو نمایاں ہوتا ہے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے طاغوت پر کوڑا بن کر

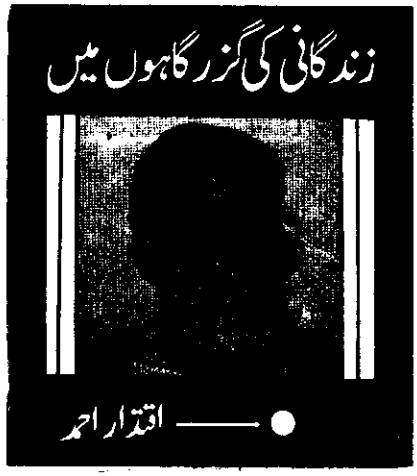

پڑنے کے لئے پیدا کیا ہو' ان پر جلال ربانی کی چھاپ دوسرے سب اثرات سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کورنگی کراچی میں حضرت مفتی محمد شفیع رحمت اللہ علیہ کے دارالعلوم کا میں پڑوسی تھا۔ حضرت سے گاہے گاہے علیک سلیک ہو جاتی۔ ان کی درویشانہ نشست و برخواست اور گفتگو کے دھیمے انداز نے تب متاثر کیا جب اپنے بڑے بیٹے کے حفظ قرآن کے سلسلے میں مجھے ان کے ادارے سے تعاون کی ضرورت پیش آئی اور براہ راست ان سے رابطہ بھی رہا۔ وہ ایک دلآویز شخصیت کے مالک تھے' سر سے پاؤں تک سادگی کا نمونہ۔ اٹھنا بیٹھنا اور پہننا اوڑھنا بھی بالکل سادہ' بات چیت اس سے بھی زیادہ سادہ اور اس سادگی کے حسن کو تواضع' عاجزی' انکساری اور تحمل و بردباری نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں اپنے پہلے حج کے موقع پر وہ مجھے ایک سہ پہر تن تنہا مسجد نبوی کے صحن میں ایک طرف کو بیٹھے ذکر و فکر میں مگن نظر آئے۔ ان دنوں مولانا مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" اور جواب میں محمود احمد عباسی کی تصنیف "خلافت معاویہؓ و یزیدؒ" کا بہت چرچا تھا۔ اس کے علاوہ کئی بار مواجہہ شریف کے قرب و جوار میں بیٹھے میں اس کھود کرید میں رہا تھا کہ ان جالیوں کے پیچھے کیا ہے۔ حضور ﷺ اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی قبور حرم کے فرش کی سطح سے کتنا نیچے ہیں اور کیسی دکھائی دیتی ہیں' وغیرہ۔ حضرت کو پا کر میں نے موقع غنیمت جانا اور جا کر سلام کے بعد ان کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔

عرض کیا کہ حضرت' آپ تو نیچے مرقد مبارک تک گئے ہوں گے' وہاں کا کچھ حال سنائیے' کیا محسوس ہوتا ہے؟۔ وہ بطیب خاطر میری طرف پوری طرح متوجہ تھے لیکن یہ سوال سن کر سر جھکا لیا اور قدرے توقف کے بعد چہرہ اٹھایا تو اس پر حسرت سے ملتا جلتا کچھ ایسا تاثر تھا جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ پھر سرگوشی کے سے انداز میں بولے "بھائی' پاکستان کا مفتی اعظم رہا ہوں اور اب بھی اللہ کے فضل سے سعودی حکومت اتنا اکرام کرتی ہے کہ جب بھی خواہش کا اظہار کروں' میرے لئے دروازہ کھول دیا جائے گا لیکن سچی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اتنے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی"۔ یہ کہہ کر حضرت نے پھر سر جھکا لیا اور کچھ دیر مراقبے کی کیفیت میں رہے۔ میری طرف دوبارہ متوجہ ہوئے اور حال پوچھا تو ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ آخری سوال میں نے ان سے یہ کیا کہ مولانا مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پر آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ فرمایا کہ اس پر میں کچھ زیادہ کہنے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا' بس اتنا جانتا ہوں کہ مولانا نے بڑھاپے میں ایک بہت بری کمائی کی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا' کسی بھی معاصرانہ چشمک' غرور علم اور فتور نیت سے پاک و صاف اور جذباتی ہیجان سے قطعاً عاری۔

حضرت مفتی محمد شفیعؒ کا انتقال دل کے مرض میں ہوا۔ زندگی کے آخری دن انہوں نے کراچی کے مشہور کارڈیو وسکولر ہسپتال میں گزارے۔ اس کے انچارج ڈاکٹر اس زمانے میں جو ماہر امراض قلب تھے' وہ سید زادے اور ایک معتدل مزاج مسلمان ہیں۔ اپنے ایک پرانے دوست سے بے تکلف گفتگو میں

انہوں نے مفتی صاحب کی مرض الموت کی وہ کیفیت بیان کی جو انہوں نے خود ہسپتال میں دیکھی تھی۔ اسی ثقہ راوی کا کہنا ہے کہ بقول ڈاکٹر صاحب کے مفتی صاحب پر پے بہ پے دل کے شدید دورے پڑ رہے تھے اور وہ تکلیف سے بے حال رہے' موت بھی یقیناً پائنتی کھڑی نظر آتی ہو گی لیکن اس حال میں بھی کہ مفتی صاحب تکلیف اور اختلاج قلب کے باعث پسینے میں نہائے ہوتے' ڈاکٹر صاحب کی طرف سے پرسش احوال پر جواب ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ "الحمدللہ' بالکل ٹھیک ہوں" اور یہ کہتے ہوئے ان کا چہرہ ملکوتی سکون و طمانیت کے نور سے روشن ہوتا تھا۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ انہی دنوں ایک اور بھی مشہور و معروف مذہبی شخصیت اسی مرض میں مبتلا قریب ہی کے ایک کمرے میں زیر علاج تھی۔ مرحوم مجلسوں کی جان تھے اور پورے ملک میں ان کے اعجاز بیان کی دھوم تھی جس کی فیس بھی وہ ٹھوک بجا کر وصول کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اور ان کی بھی مغفرت فرمائے لیکن بہرحال موت کو سامنے دیکھ کر ان کی گھگی بندھی رہتی تھی۔ وہی ڈاکٹر صاحب جب ان سے جا کر حال پوچھتے تو وہ روتے چلاتے ہوئے کہتے کہ ہائے' مر رہا ہوں اور پھر ہاتھ جوڑ دیتے "ڈاکٹر صاحب مجھے بچا لیجئے' خدا کے لئے کچھ کیجئے"۔ اور ڈاکٹر صاحب کے لئے وہاں سے ٹلنا مشکل ہو جاتا۔ اللہ کے یہ دونوں بندے اس کے بعد چند ہی دن دنیا کے مہمان رہ سکے۔

کراچی میں مختصر اور منحنی سا جسم رکھنے والے ایک میمن سیٹھ تھے جو اس اعتبار سے اپنی کاروباری برادری میں منفرد بھی تھے کہ ان کا ایک (یا شاید واحد) بیٹا بہت پڑھنے لکھنے والا نکلا اور اگر جوانمرگی نے اسے اچک نہ لیا ہوتا تو ملک کے ممتاز دانشوروں میں اس کا شمار ہوتا۔ سیٹھ صاحب سگلنگ اور دوسرے کالے دھندوں میں استادانہ مہارت رکھتے تھے اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کی حکومت کے آخری دنوں میں چینی کے لئے جو ہاہا کار مچی' اسے پیدا کرنے میں کچھ کارستانی ان کی بھی تھی۔ حکومت کو معلوم تھا کہ کراچی کے بڑے کاروباریوں نے باہر سے چینی منگوائی ہے اور اس کی آمد کے ساتھ ہی یہ بحران ٹل جائے گا لیکن وہ چینی سیٹھ صاحب کے ہتھے چڑھ گئی۔ مال ابھی راستے میں ہی تھا کہ پورا کا پورا جہاز انہوں نے مقامی درآمد کنندگان سے خرید لیا جنہیں اتنی جلدی اپنا سرمایہ مع منافع واپس ملتا نظر آیا تو انہیں اور کیا چاہئے تھا جبکہ پیسہ سیٹھ صاحب کے لئے کبھی کوئی مسئلہ رہا ہی نہیں' ہیر پھیر کے کاروبار نے ان کے ہاں دولت کے انبار لگا رکھے تھے۔ یہ ساری چینی سیٹھ صاحب کے گوداموں میں جا کر بند ہو گئی اور صارفین ہائے چینی' وائے چینی کرتے رہ گئے' بھاؤ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

اب یہی سیٹھ صاحب ایک شوگر مل لگا رہے تھے اور ایک مشاورتی فرم کے مالک انجینئر صاحب خواہشمند تھے کہ اس کی تعمیر کا کام ان کے ذریعے میری کمپنی کو دلوا دیا جائے۔ انجینئر صاحب نے سیٹھ صاحب سے ملاقات کا وقت مانگا تو مہربان ہو کے انہوں نے اتوار کو یعنی چھٹی والے دن ہمیں اپنے دولت خانے پر ہی بلا لیا کہ "ذرا کھلی بات ہو گی"۔ ہم دونوں وقت مقررہ پر ان کی محل نما کوٹھی پہنچے اور ملازم نے بڑے سارے ڈرائنگ روم تک رہنمائی کر دی تو دیکھا کہ وہاں تو دیوان عام کا سا ماحول ہے۔ ان کے حلقہ احباب سے تعلق رکھنے والے کئی بیوروکریٹ اور ایک دو اکہرے بدن والے دراز قد میمن سیٹھ بیٹھے نظر آئے جبکہ متعدد ملازموں کی آمدورفت بھی جاری تھی جو طرح طرح کی بندوقیں اور رائفلیں صاف کر کے لاتے اور سامنے والی دیوار کے سہارے ایک لائن میں لگاتے جاتے تھے۔ البتہ سیٹھ صاحب کے عین مقابل ایک قیمتی کرسی پر جو صاحب رونق افروز تھے' انہیں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ سفید براق لباس میں ملبوس نورانی چہرے والی یہ شخصیت مولانا احتشام الحق تھانوی کے سوا کون ہو سکتی تھی جن کی خوبصورت لمبی اور بھاری لیکن بڑے سلیقے سے تراشیدہ سفید داڑھی کی اوٹ میں سیاہ بال بھی چھلیں کرتے پائے جا رہے تھے۔ مولانا کی خوش پوشاکی کا حوالہ محاورے کے طور پر دیا جاتا تھا لہٰذا یہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ٹوپی اور کاندھے پر پڑے قیمتی رومال سے لے کر جوتی تک کی بے داغ سفیدی میں ان کا سرخ و سپید چہرہ نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ مخصوص تھانوی ٹوپی' کرتے اور اس میں سے جھانکتے بنیان' ہوا جیسی ہلکی صدری اور تنگ پائنچے والے شلوار نما پاجامے میں اپنی اپنی نوع کا بیش قیمت کپڑا استعمال ہوا تھا جس پر کلف دینے کے بعد دھوبی کی استری نے تو کاریگری کے جوہر دکھائے ہی تھے لیکن مجال ہے جو مولانا نے بھی ان میں کوئی خلل واقع ہونے دیا ہو۔ کہیں کوئی ایک بھی شکن پڑی ہو تو حرام۔ میں اس محفل میں انہیں دیکھ کر مبہوت سا ہو کر رہ گیا اور سلام کے سوا ان سے کچھ کہنے سننے کا یارا ہی نہ رہا۔

معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب ہم جیسے اہل غرض کے معاملات نمٹانے کے بعد شکار پر نکلنے والے ہیں اور مولانا احتشام الحق تھانوی سمیت وہاں موجود سب احباب ان کی شکار پارٹی کے شرکاء و مدعوئین ہیں۔ میں ابھی دریائے حیرت میں غوطے ہی کھا رہا تھا کہ کہاں یہ پست قد اور دبلا پتلا سا اٹھا پٹھا میمن سیٹھ اور کہاں شاٹ گنوں اور دور مار رائفلوں کا یہ ذخیرہ جو "خریدا بیچا" میں نہیں بلکہ شکار میں استعمال کے لئے جمع کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا تھانوی کی ان حضرت سے کیا مناسبت' ان کے مشاغل سے کیا دلچسپی --- کہ پردۂ غیب سے ایک اور واقعہ کا ظہور ہوا جس نے میری سٹی بالکل ہی گم کر دی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میلے سے عربی لباس یعنی ثوب اور سیاہ عقال سمیت سرخ و سفید خترے میں دو عرب کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور بلند آواز سے السلام علیکم کہنے کے بعد صرف سیٹھ صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہی کے ہاتھ کو بے تکلفی سے کھینچ کر ذرا فاصلے پر کونے میں رکھے ہوئے ایک بڑے صوفے میں انہیں بیچ میں رکھ کر دھنس جاتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان ایسی آواز سے گفتگو شروع ہو جاتی ہے جو ہم تک بھی آسانی سے پہنچ رہی ہے۔ وہ جزیرہ نمائے عرب کے مغربی ساحل کی "لہجہ شعبیہ" یعنی "کلوکیل" زبان میں بات کرتے ہیں اور یا للعجب' سیٹھ صاحب بھی اسی بے تکلفی سے وہی زبان بولتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں۔ چند منٹ کی حیص بیص کے بعد ایک عرب نے پہلو کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کپڑے کی ایک میلی سے تھیلی باہر نکال کر سیٹھ صاحب کے حوالے کر دی جسے کھول کر انہوں نے سب حاضرین مجلس کے سامنے ہی اپنی بائیں ہتھیلی پر الٹایا تو وہ مٹھی بھر سچے موتی تھے۔ سیٹھ صاحب نے کھیل کے سے انداز میں سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے دو چار باران میں سے کچھ موتیوں کو اٹھا کر الٹے ہاتھ میں پھینکا اور ان کی چمک دمک اور آواز سے محظوظ ہونے کے بعد عربوں کو تو نہ جانے کیا کہہ کر رخصت کر دیا اور ہم سے مخاطب ہوئے۔

"آپ لوگ کا کیا خیال ہے؟۔ اس مال کی قیمت کیا ہو گی؟" --- حاضرین کی زبانیں گنگ رہیں۔ پھر اپنی

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بقیہ : سنو نیٹو سنو!

اب سوال یہ ہے کہ اس عالمی پروپیگنڈے کا توڑ کیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ گھر میں ناچاقی اور افراتفری برپا ہو تو باہر والوں سے کسی عزت و احترام کی توقع کرنا پاگل پن کے سوا کچھ نہیں۔ سب سے پہلے تو یہی حل طلب مسئلہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کو جو طاقت حاصل ہو گئی ہے' اس کا ٹھیک طور سے احساس کرنا ہوگا۔ اور ہر قسم کے ذرائع اور وسائل کو بروئے کار لا کر عالمی سطح پر حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ بیرونی نامہ نگار مسلم معاشرے کے حالات سے بالکل نابلد ہوتے ہیں' ان کی رسائی اکثر سامراج کے پروردہ مسلمانوں کے بالائی طبقوں تک محدود رہتی ہے جو ہر خیر سے عاری ہے۔ عوام میں سے ایسے لوگ آگے آئیں جو گمراہی کے جدید اندھیاروں کا قلع قمع اسلام کی روشنی سے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں لیکن انہیں اپنی بات سنانے کے لئے سڑکوں پر آنا پڑے گا۔ دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام پوری نوع انسانی کی بھلائی چاہتا ہے۔ بے گناہ لوگوں کا کشت و خون اسلام کا شیوہ نہیں' سامراجی قوانین و ضوابط اصل فساد کی جڑ ہیں۔ جب تک طاقت سے اس کا خاتمہ نہیں کیا جاتا' حقیقی امن نہیں آسکتا۔ دنیا کو بتانا ہوگا کہ الجزائر اور مصر میں بے گناہ لوگوں کا جو خون بہہ رہا ہے اس کا ذمہ دار عالمی سامراج اور اس کے پٹھو حکمران ہیں' اسلام نہیں۔ مصر میں جاری تصادم کو جس طرح بیرونی عناصر نے اچھالا ہے اس سے مسلمانوں کے بارے میں غلط تاثر ابھرا ہے۔ اس وقت دنیا بڑی تیزی سے تبدیلی کی طرف جا رہی ہے۔ "اٹاوہ سٹیزن" کے ایڈیٹر ڈیوڈ ایونس David Evans بڑے نمایاں الفاظ میں اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"سرائیوو سے خونی تصویروں کا سلسلہ بہت ہو چکا..... بربریت کے مناظر بہت دیکھے جا چکے' انہیں بند کرو۔ سنو نیٹو سنو!" ○○

بقیہ : زندگانی کی گزرگاہوں میں

بات جاری رکھی۔ "خیر چھوڑو' چلو آپ لوگ ایک مزے کا قصہ سنو۔ ابھی کچھ دن پہلے میں جاپان سے آیا تو بریف کیس میں چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں لاکھوں کے اصلی موتی تھے۔ انہیں کپڑوں کے ایک جوڑے اور دو چار فائلوں کے نیچے رکھنے کے بعد بالکل اوپر بھی اصلی موتیوں کا ایک دوہرا ہار رکھ لیا تھا جو کسٹم والے کو بریف کیس کھولتے ہی نظر آ گیا۔ اس نے بڑی خوشی سے اس پر جھپٹا مارا کہ چلو آج تو سیٹھ قابو آیا۔ دو انگلیوں سے اٹھا کر اپنے اور میرے درمیان لٹکایا اور بولا سیٹھ یہ کیا ہے۔ میں ہنس پڑا اور بولا امی ٹیشن ہے' امی ٹیشن (نقلی موتی ہیں) بچی نے ضد کی تھی' اس کے لئے لایا ہوں--- آپ رکھ لیں' رکھ لیں آپ کے گھر میں بھی تو کوئی بچی ہو گی۔ میری بچی آپ کی بچی' آپ کی بچی میری بچی' رکھ لیں' ایک ہی بات ہے" سیٹھ نے سانس لیا اور کھل کے ایک قہقہہ لگایا۔ "پھر پتا ہے کیا ہوا' وہ بے چارہ کسٹم والا سٹپٹا کر رہ گیا' ہار واپس پھینک کر جیسے وہ کوئی سانپ تھا' اس نے کھٹ سے میرا بریف کیس بند کر دیا۔ کہنے لگا جائیے سیٹھ صاحب' رہنے دیجئے میں آپ کی بچی کا دل کیوں برا کروں!"۔

اس قصے سے محظوظ ہونے کے بعد مولانا تھانوی نے کرسی میں بیٹھے بیٹھے کسمسانا شروع کر دیا۔ سیٹھ سے فرمایا کہ بھئی' اب تو بہت دیر ہوتی جا رہی ہے۔ آج کا پروگرام ملتوی کر دو ورنہ مجھے تو اجازت دے ہی دو' کئی ضروری کام یاد آ گئے ہیں۔ پھر سیٹھ صاحب کے باصرار روکنے پر بھی وہ رکے نہیں اور تشریف لے گئے۔ ہم دونوں نے بھی دو چار جملوں میں چند تمہیدی باتیں کیں اور اجازت لے لینے میں خیریت دیکھی۔ باہر آ کر اپنی اپنی گاڑیوں کے دروازوں میں چابیاں ڈالتے ہوئے میں نے اپنے ہمراہی سے کہا کہ "جناب اس پروجیکٹ کا خیال چھوڑ ہی دیجئے' سیٹھ صاحب ہم دونوں کو بیچ کر کھا جائیں گے"۔○○

بقیہ : نوائے وقت

انہیں (یعنی ڈاکٹر اسرار احمد کو) اصل بدی کے مقابلے میں آنا چاہئے..... اس لئے اندیشہ دور دراز سے نکل کر حقائق کی دنیا میں قدم رکھنے کی ضرورت ہے اور مرض کی اصل تشخیص کے مطابق ایک عمرانیاتی ڈاکٹر بن کر جاگیرداری کے خاتمے کا نسخہ سامنے لانے کی ضرورت ہے"۔ تو اس پر کوئی سرنہ پیٹ لے تو بتائیے کیا کرے کہ یہ ضرورت اس شخص کو جتائی جا رہی ہے جو عشروں سے جاگیرداری کو ام الخبائث اور اس کی لے پالک مزارعت کو اسلام میں حرام قرار دیتا چلا آتا ہے بلکہ غیر حاضر زمینداری کی بھی جڑ کاٹ دینے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس نے تو وفاقی شرعی عدالت کے اس عذر کا توڑ بھی پیش کرتے ہوئے کہ تحدید ملکیت کرتے ہوئے کسی شخص سے اس کی زمین کس بنیاد پر چھینی جائے گی' یہ اعلان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تاریخی اجتہاد کے مطابق جس پر امت کا اجماع ہو گیا تھا اور رواں صدی کے اوائل تک خلافت عثمانیہ کے تحت جو زیر عمل بھی رہا' پاکستان کی زرعی اراضی عشری نہیں خراجی ہے۔ اسے بیت المال کی ملکیت قرار دیا جائے تاکہ کاشتکار جو زمینداروں جاگیرداروں کے چنگل سے نکل کر اسلامی ریاست کا موروثی مزارعہ بن جائے گا' فصل کا مقررہ حصہ براہ راست ریاست کے بیت المال میں جمع کرائے۔ یہ "صدری نسخہ" ڈاکٹر صاحب موصوف نے بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہی عام نہیں کیا' مرحوم جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں اپنی دوماہی رکنیت سے مستعفی ہونے سے پہلے خود ان کی زیر صدارت ایوان میں بھی پیش کر دیا تھا۔ جاگیرداری کے خاتمے کا اس سے بڑھ کر بھی کوئی شافی نسخہ ہو سکتا ہے؟۔○○

بقیہ : خطبہ خلافت

جزیہ سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ جب نظام خلافت کے تحت اسلام کا اقتصادی نظام قائم کیا جائے گا تو موجودہ ڈھانچہ مکمل طور پر بدل دیا جائے۔ اس وقت تک ہم ریاست کو اس تحفظ کی ضمانت کے عوض جو ہمیں ریاست کی طرف سے حاصل ہے "جزیہ" دے رہے ہیں' جسے ٹیکس کہا جاتا ہے۔○○

بقیہ : نظام میں اصلاحات

کتنی ہی خرابیوں کو انگیز کرنا پڑے۔ تاہم غنیمت ہے کہ ملک کے پڑھے لکھے اور ذہین طبقے میں ایسے افراد موجود ہیں جو ملک میں جاری سیاسی' معاشرتی اور معاشی نظام کی خرابیوں کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو دین کی طرف بلایا جائے اور اس نظام کی برکات سے آگاہ کیا جائے جس کے بارے میں وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس نظام کو گلے لگانے کے لئے بے قرار ہو جائیں گے جو انسانوں کے خالق نے انسانوں کے لئے بنایا ہے۔ جب ان پڑھے لکھے ذہین نوجوانوں میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

تو وہی وہ دن ہو گا جب وطن عزیز میں اسلام کا نظام عدل اجتماعی نافذ ہو جائے گا اور ظلم و جبر و استحصال کا دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔○○

Muslim rule never changed till the break-up of *Khilafah*. First, Shari'ah remained the law of the state, everywhere. Second, the concept of One Ummah remained a real life concept, with no restrictions on travel and residence of any Muslim in any part of the Muslim world so at the level of the people it remained one Islamic state. Then he adds: 'And even a nominal head of the Ummah is better than not having one at all.

Recent history supports the last contention. In the last century a drama company planned to stage a play by Voltaire titled 'Muhammad or Fanaticism', which derided the Prophet, Allah's blessings and peace on him. The French government stopped the play at the request of Khalifah Abdul Hamid II (1842-1918, reigned 1876-1909), but England refused, saying: 'This is England. The banning of the play would be an infringement on the freedom of our citizens'. Khalifah Abdul Hamid II then reportedly issued an ultimatum: 'I will issue an edict to the Islamic Ummah declaring that England is attacking and insulting our Prophet. I will declare Jihad'. Upon hearing this, Britain's affirmation of 'freedom of speech' was expeditiously forgotten and the performance of the play was quickly stopped, notes Turkish author Nurittin Topcu. Remember *The Satanic Verses*?

This may sound irrelevant in the context of today's Pakistan. But the real issue is that the divergence between two interpretations of the same term could not be greater. There are two very different world views and they cannot simultaneously be expressed by the same words. In Pakistan today the vocabulary of Pakistani Nationalism does not evoke the ideas of Islamic Khilafah or anything other than a pure nation-state. It provides the setting in which questions like why should we impose Shari'ah law in the Islamic republic seem to be legitimate; the notices of expulsion given to 'foreign' Mujahideen sound legal; playing a sub-servient role in Somalia and elsewhere makes sense; discussion of nuclear issue only with reference to India, and not to Israel, does not require a second thought; and repeal of laws dealing with the defamation of the Prophet under foreign pressure seems proper.

The Islamic state of Pakistan for which the 'ulama and the masses struggled was not the *Khilafah* but it was conceived in the image of *Khilafah*, a way station on the path of the universal Islamic *Khilafah*. When Pakistan and Islam were considered synonymous, it was not to give a new meaning to Islam, but to give an established meaning to Pakistan. It would seem that the meaning has been quietly hijacked.

What is more, the terminology of nationalism is not even good for the nation-state that it is expected to serve. For in that sense Pakistan is an artificial nation, and not an economically prosperous one at that. Therefore its nationalism can only spawn the sub-nationalism of linguistic groups that has become the number one internal problem for the country.

The other pillar in the strategy for keeping Pakistan together, namely the threat of India also is not without problems. First, two decades of watching Indian movies have considerably changed public attitudes. Second, a threat may evoke the reflex to fight or to surrender based on the perceived difference in power projection capabilities of the threat and the threatened party. If the difference is very large or perceived to be very large, the threat may have just the opposite effect. The declared Western aim of guaranteeing Israel's military superiority over all the Arab countries combined and the undeclared aim for guaranteeing India's superiority over all its neighbours obviously have this consideration. That is why there is so much interest in producing nuclear disparity between Pakistan and India. Third, a threat is a negative force, which can help to keep a 'group' together provided there is some agreed upon definition of the group. In other words it can work only to enhance the value of a positive factor, it cannot be substituted for it.

The beginning of the 20th century saw the break up of *Khilafah*. It would be some consolation if we can sow the seeds of an active mass movement for the restoration of *Khilafah* before the end of this century.

Fourth, and most important from an Islamic perspective, defining Pakistan in terms of India has the most negative impact on Islamic Da'wah work among the new generation of Indians in the West. Abdul Rahman, a bright young engineer who lives in California accepted Islam recently. His family is still Hindu. He says that Hindus of his generation are not even taught their religious books because they would just laugh at the contents. Who can take these stories seriously?, he asks. Their parents define their Hinduism in terms of vague Indian-ness. A lot of them are looking for answers. Islam provided the answers for Abdul-Rahman and one of his friends, but to do that they had to cross the big barrier of anti-Pakistan feelings which are in turn reinforced by the anti-India feelings.

Somewhere Muslims fail to conduct themselves as the bearers of a universal message. Abdul-Rahman, naturally, does not have warm feelings about the Pakistanis 'who may speak for hours showing their pride for Pakistan while the time for prayers comes and goes'.

But Pakistan is a precious part of the Muslim world. For nearly half a century it has been stated that 'Pakistan was created in the name of Islam. It cannot survive without it'. Words have a way of losing meaning, not just through lack of use, but also through empty use, the use without attendant action and thought. These words have become prey to that.

It is time now to articulate that message in a more forceful way with a greater vision for the future. It may be time to drop the vocabulary of nationalism in favour of that of *Khilafah*. Only that can overcome both the sub-nationalism of linguistic groups as well as the secular nationalism of the bureaucracy. Only that can provide an effective answer to the New World Order. There are many future maps of the world published by think tanks in the US that suggest a break-up of Pakistan and Afghanistan along ethnic lines. They may reflect a wish or they may reflect a plan. But the only way to counter that is to have a better plan. And it is not just Pakistan. Afghanistan and Central Asia also need that plan.

No one suggests that it can be done overnight; a long period of educating the masses and the future leaders will be needed. But a change in direction must take place. The beginning of the 20th century saw the break up of *Khilafah*. It would be some consolation if we can sow the seeds of an active mass movement for the restoration of *Khilafah* before the end of this century.

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

لندن کے ماہنامے "اسپیکٹ انٹرنیشنل" کے تازہ شمارے میں خالد بیگ صاحب کا ایک تجزیہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے مستقبل کے اسلام سے وابستہ ہونے اور نظام خلافت کے قیام کا اس ملک خداداد کا مقدر ہونے پر فاضل تجزیہ نگار کے خیالات بالکل وہی ہیں جن کی نشرو اشاعت کا فریضہ ہم انجام دے رہے ہیں۔ اسے توارد بھی کہا جا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت نظریاتی ہم آہنگی اس اتفاق کا سبب ہے کہ دوسرے صفحہ پر مصنف نے جس جملے کو ایک الگ چوکھٹے میں نمایاں کیا ہے' اس کے اردو ترجمہ کی بہت دنوں پہلے داعی تحریک خلافت کی ایک تقریر پر ہم نے ذیلی سرخی جمائی تھی۔ ——— مدیر

pakistan

Deepening crisis of identity and existence

Islamic state, nation-state or non-state?

Khalid Baig

When Pakistan and Islam were considered synonymous, it was not to give a new meaning to Islam, but to give an established meaning to Pakistan.

She was taught, as a child , by Irish Nuns and as a teenager, by British professors. She is concerned about 'radicals' and 'Islamic fundamentalists' in her country and openly seeks American help in countering them. American journalists look equally favourably at her high heels, her bare head, a 'thousand-watt' smile, and her obviously enlightened ideas about the world. Maleeha Lodhi is the ambassador of the Islamic Republic of Pakistan to the United States, although she seems to be more qualified for the job of the US ambassador to Pakistan. It may be difficult to discern any difference in the world views, values, or lifestyles of Maleeha Lodhi, Benazir Bhutto, or Tansu Ciller, but the first two represent and rule an Islamic Republic; the last one heads an officially secular state.

What brings an Islamic Republic and a secular Muslim state on converging paths is not just Western power, but also a western idea, namely that of a nation-state. For its government and bureaucracy, Pakistan, like Turkey, is a nation-state. Its foreign policies are only articulated in terms of territorial 'national interests' and 'national concerns'. Official Pakistan is seeped in the vocabulary of nation-state and it aspires to look just like any other nation-state. The real problem is that we do not have strong enough national feelings, so the thinking goes, in a country where sub-nationalities threaten to tear it apart.

'Pakistani nationalism and the threat of India are the twin instruments used to keep the country together', observes Dr Asim Husain who lives in the US and has spent a life time studying the subject, ever since Abul A'la Maudoodi forcefully suggested that Islamic universalism was a totally different idea from Muslim Nationalism. 'The problem is that nationalism will always give rise to sub-nationalism when it is not economically prosperous. This is because territorial nationalism is based on self interest. An Islamic state, on the other hand, is based on ideology'.

To understand Pakistani nationalism, one needs to dig a little deeper. The forces that took part in the Pakistan movement represented a mixture of Muslim nationalism and Islam. In philosophical terms they came from two centres; Aligarh and Deoband. This is admittedly a simplification but it helps to understand the basic conflict. Aligarh, with all its diversity, represented Muslim nationalism. The 'ulama from Deoband were in two camps. One opposed the idea of Pakistan, the other, led by Maulana Shabbir Ahmed Usmani, considered it a religious duty to actively support the Pakistan movement. They supported the creation of a state that would be ruled by nothing but Islamic Shari'ah, an idea that inherently precludes a nation-state in the same way that Islam itself precludes territorial nationalism. They gave fatwas that to support the Hindu-dominated Indian National Congress (and hence to oppose Pakistan) was to support Kufr. The Jama'at-e-Islami remained indifferent to the Pakistan movement on philosophical grounds, an act which has put it on the defensive in all the three countries of the Indian sub-continent on the issue of loyalty to the nation-state.

The role of the 'ulama was indispensable during the Pakistan movement; it was obvious that without them the crucial elections in Punjab and Frontier could not be won and therefore Pakistan had no chance of becoming a reality. But after the country was established, they were considered a burden by the well placed nationalist element that actually took control of government. The ideas of governance thus evolved in a nationalistic framework under the slogan of Pakistani nationalism. (Those who love to blame the 'ulama for the ills of the country may do well to remember that 'ulama never had any part in the government).

For their part the Ulema and the Islamists just interpreted Pakistani nationalism as another term for Islam. In the context of Pakistan movement, it was simple. Pakistan was meant to be an Islamic state. To be a good Pakistani meant to be a good Muslim, and vice versa. To have strong national feelings about Pakistan meant to have strong feelings for Islamic brotherhood. Thus a common language was used by both groups, the nationalists and the Islamists, but beneath that there were wide differences. The conceptual framework in which real life situations are analysed and decisions are made by the Pakistani rulers are rooted in secular nationalism. A thin veneer of 'Islamic brotherhood' is used to make this secularism more palatable for the masses. 'The masses, in Pakistan, as in other Muslim countries think in terms of the Ummah,' says Dr Asim Hussain. 'But their governments think in terms of nation-state'.

So also do some Muslim intellectuals. 'The nation-state remains the basic reference of International relations.' says Dr Mumtaz Ahmed, who teaches political science at Hampton University in Virginia, US. He asserts that there is no going back. 'Certain historic processes are irreversible.' Dr Hussain counters: 'That is what they said about communism also. Throughout history those who support the status quo have argued that the current state was irreversible. Those who wanted to change it were called dreamers'.

Dr Ahmed raises another objection. Muslims did not always have central political power. For a long time the *Khalifah* was just a nominal head. Dr Hussain points out that despite all the problems, three characteristics of